اصحابِ کہف

اصحابِ کہف

★

مولانا ابوالکلام آزاد

★

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس
۱۴۹۱، کوتانہ اسٹریٹ، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بار اوّل — فروری ۱۹۸۷ء

نام کتاب — اصحابِ کہف

مؤلف — مولانا ابوالکلام آزاد

ناشر — اعتقاد حسین صدیقی

مطبع —

قیمت — روپے

واقعاتِ اصحابِ کہف ذوالقرنین

★★★

خلاصہ

سورہ کہف آیت ۹ سے اصحاب کہف کی سرگزشت شروع ہوئی فرمایا:۔
یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اس میں پوشیدہ رہے آبادی سے ان کا کوئی علاقہ نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی صدا ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی پھر وہ اٹھائے گئے یعنی ظاہر ہوئے اور یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ واضح ہو جائے دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت ایسی تھی جو وقت کے واقعات اور ان کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی

دو جماعتوں سے مقصود اصحابِ کہف اور ان کی قوم و ملک کے لوگ ہیں یہ گویا اس تمام معاملے کا ماحصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں۔ چنانچہ آیت نمبر ۱۳ میں فرمایا: نحن نقص علیک نبأھم بالحق

(الف)

ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کش ہو جانا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو جانا۔ ان کی قوم چاہتی تھی، انہیں سنگسار کر دے، یا جبراً اپنے دین میں واپس لے آئے انہوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا

(ب)

جب وہ غار میں اٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کے لئے بھیجا

تفسیر

اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن حکمتِ الٰہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گئی اور یہ معاملہ لوگوں کے لئے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

(ج)

جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی، وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا

(د)

اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں بعض کہتے ہیں وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں پانچ تھے بعض کہتے ہیں سات تھے مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ دیکھنا چاہیے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے "بطرا" کہنے لگے

عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے اُن میں ایک پیٹرا بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کردیا ہے

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں، اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا، تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نو آبادی کی حیثیت اختیار کرلی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی ۶۳۰ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا، یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا

جنگ کے بعد سے اس علاقے کی از سر نو اثری پیمائش کی جارہی تھی اور نئی نئی باتیں معلومات میں آرہی ہیں۔ از آں جملہ اس علاقے کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوتے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ تخیل کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام "الرقیم" بتلادیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کیے جائیں

اصحاب کہف

عیسوی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و دہشت سے عاجز آ کر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پا گئے اور ایک عرصہ کے بعد اُن کی نعشیں برآمد ہوئیں چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گزرا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے، ایک افسس میں بیان کیا جاتا ہے

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا؟

قرآن نے "کہف" کے ساتھ "الرقیم" کا لفظ بھی بولا ہے، اور بعض آئمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا۔ اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں "رقیم" کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے

الرقیم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا ہوا

اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں۔

اصل واقعہ

(۱) آیت (۹) "ام حسبت ان اصحاب الکہف والرقیم کانوا من آیاتنا عجباً؟" کا اسلوب خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ "اصحاب الکہف والرقیم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرت الٰہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وحی الٰہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کر رہی ہے چنانچہ پہلے مجملاً اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلا دیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ عبرت و تذکیر کی بات ہے وہ یہ ہے۔ پھر آیت (۱۳) میں فرمایا "نحن نقص علیک نباہم بالحق" اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنا دیتے ہیں، یعنی واقعہ کی چند ضروری تفصیلات بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں

یہ مجمل خلاصہ جو آیت نمبر (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے۔ تمام سرگزشت کا ماحصل ہے۔ اسی کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہییں۔ فرمایا:

ہو گئی۔ اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جا رہی ہے اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے وہاں پہلے ترسیس آباد تھا، جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

اور بغیر کسی بنیاد کے اسے "مکتبہ" پر محمول کیا جائے

علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں

قرآن نے جس طرح اِس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس واقعے کی عرب میں شہرت تھی لوگ اِس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اِسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائلِ معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دُور کی باتیں ان کے علم میں آئی ہوں۔ پس ضروری ہے کہ یہ قرب و جوار ہی کی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جا سکے جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جُلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اوّل تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر، ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی۔ اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے یقیناً نبطیوں میں اِس واقعہ کی شہرت ہوگی۔ اور انہی سے عربوں نے سنا ہوگا۔

خود قریشِ مکّہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے۔ اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحلِ خلیج سے لے کر ساحلِ مارمورا تک تعمیر کردی تھی[۱] پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا بلکہ اِس نواح کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھی اِس لئے اِس سے زیادہ قدرتی بات کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو

---

[۱] جنگ کے بعد۔ اِس شاہراہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں

دعوتِ حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباعِ حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔

(ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کر دی ہیں۔ جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے اُن کی مخالفت میں تمام باشندے کمر بستہ ہو جاتے اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے تو سنگسار کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے مونہہ موڑیں اور کسی غار میں معتکف ہو کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں مقیم ہو گئے

غار کی نوعیت

ان کا ایک وفادار کتا تھا وہ بھی اُن کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہ لی وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پا سکتیں۔ نہ تو چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے یعنی غار اپنے طول میں شمال وجنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔ روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پا سکتی

اس صورتِ حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ زندہ رہنے کے لئے وہ نہایت معتدل اور محفوظ مقام ہے

چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے موںہہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزین ہوگئے اُن کے پیچھے ظلم وستم کی قوتیں تھیں، سامنے غار کی تاریکی، وحشت تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا خدایا! تیری ہی رحمت کا آسرا ہے اور تیری ہی چارہ سازی کا بھروسہ!" چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا۔ تاکہ واضح ہو جائے ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا۔ جس نے اس عرصہ میں نتائج عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے؟ یعنی صورتِ حال نے دو جماعتیں پیدا کر دیں تھیں۔ ایک اصحابِ کہف تھے۔ ایک اُن کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی دوسرے نے ظلم و تشدد پر کمر باندھی پھر چند برس کی مدت دونوں جماعتوں پر گذری تھی۔ اُس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اُس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے پر انہیں مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں میں سے کس نے کمایا ہے؟ اور کس نے کھویا ہے؟ کون اِن دونوں میں وقت کا بہتر اندازہ شناس تھا؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آئی ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحابِ کہف نے اختیار کی تھی۔ کیونکہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا تو اب مسیحی ہونا کوئی ناقابلِ معافی جرم نہیں تھا عزت و سربلندی کی سب سے بڑی عظمت تھی۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پرستارانِ حق کی استقامت ہی تھی جس نے

حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا اس لئے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لئے "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ملتی نہیں لیکن وہ کہتے ہیں، یہ ایک طرح کا استعارہ ہے گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الآذان کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارہ التبعیہ

اصل یہ ہے کہ اصحاب کہف کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوتے رہے۔ اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اس طرح کی روایتیں مشہور ہو گئیں عرب میں قصہ کے اصل راوی شام کے یہودی تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جا کر ختم ہوتی ہیں جو اہلِ کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں مثلاً وہب اور سدی بہرحال اگر یہاں ضرب علی الآذان سے مقصود نیند کی حالت ہو، تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور "ثم بعثناھم" کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے۔ طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحابِ کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ البتہ قرآنِ حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ جزم و یقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

کیوں کہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے مگر دھوپ کی تپش نہیں پہنچ سکتی پھر اندر سے کشادہ ہے۔ جگہ کی کمی نہیں۔ دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کے لئے اندر کا منظر بہت ڈراونا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لئے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت بھی سامنے آتا نہیں اس لئے بالکل اجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے کی ملی جلی حالت رہتی ہے اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو اُسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ضرور ایک بھیانک منظر پیش کرے گی۔

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے۔ اِس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ کتنے عرصہ تک اِس غار میں رہے ہیں۔ وہ سمجھے تھے باشندوں کا وہی حال ہوگا جس حال میں انہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اِس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا اب غلبہ اُن لوگوں کا تھا جو اصحابِ کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے جب اُن کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا۔ ان کے ایسے معتقد ہو گئے کہ اُن کے غار نے زیارت گاہِ عام کی حیثیت اختیار کر لی اور امراءِ شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے

ج اصحابِ کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اِس بارے میں قرآنِ حکیم نے صرف اِس قدر اشارہ کیا کہ "فضربنا علی اٰذانہم فی الکہف سنین عدداً (۱۱) "ضرب علی الآذان" کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی کوئی صدا اُن تک نہیں پہنچتی تھی لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے یعنی اُن پر نیند طاری ہو گئی تھی اور چونکہ نیند کی

بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وقفے کے بعد بدلتے ہوں گے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے۔ انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے۔ لطف یہ ہے کہ تعلیم "ذات الیمین و ذات الشمال" کی تفسیر میں یہی مفسر ہمیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ بدلتی ہے بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ۔ بعض کہتے ہیں تین سال بعد، بعض کہتے ہیں نو سال بعد!

علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے اس پر ان نکتہ سنجوں نے غور نہیں کیا۔ لو اطلعت علیہم، لولیت منہم فراراً ولملئت منہم رعباً یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت ناک ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو، اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہوا غار کے اندر اصحاب کہف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بیحد دہشت انگیز ہے اگر کوئی آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے۔ معاً الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہو سکے علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکے گا وہ اتنا باریک بین نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیٹے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بہ اول نظر دیکھ لے اور وہ بھی اس حالت میں کہ دہنے یا بائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہوں

دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہوئے تخیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا

(د) آیت ۱۸۔ "وتحسبھم ایقاظا وھم رقود الخ" میں اِس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو نزولِ قرآن کے وقت تھی یا جو حالت اِس غار کی ایک مدت تک رہی۔

اِس سے معلوم ہوا کہ انقلابِ حال کے بعد اصحابِ کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی اِسی میں رہے یہاں تک کہ انتقال کر گئے ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو زندہ آدمی موجود ہیں دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کئے بیٹھا ہے حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں۔ نہ کتا ہی زندہ ہے۔

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا

اگر رقود سے مقصود سونے کی حالت ہے اور وہ لیٹے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا ہی دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا لیکن اِس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے بعض نے کہا وہ اِس لئے جاگتے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اِس کی آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہوشیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ یہی سمجھے گا کہ مر گیا ہے مگر آنکھیں کھلی رہ گئیں ہیں بعض نے کہا "نقلبھم ذات الیمین وذات الشمال" کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے تھے یعنی چونکہ وہ اپنے بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ اِس لئے دیکھنے والا خیال کرتا ہے یہ بیدار ہیں لیکن یہ توجیہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے اوّل تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے اور کروٹ

کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی کیونکہ عیسائیوں میں تعبد و تعظیم کیلئے یہی وضع رائج ہو گئی تھی [1]

غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پرواہ ہوتے تھے۔ مگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچا دیا کرتے۔ نہیں ہوتی تو بھوکے پیاسے پڑے رہتے۔ عبادات کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان کی حالت ویسی ہی تھی جیسے ہندوستان کے یوگیوں کی رہ چکی ہے اور اب بھی گاہ گاہ نظر آجاتی ہے

جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا۔ اسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرأت نہ کرتا۔ مدتوں تک ان کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں جس حالت میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کئے تھے اگر موسم موافق ہوتا

---

[1] عیسائیوں نے عبادت کی یہ وضع غالباً رومیوں سے لی کیونکہ یہودیوں کے طریق نماز میں اس وضع کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کا رکوع تقریباً ویسا ہی ہوتا تھا جیسا ہم نماز میں کیا کرتے ہیں

دنیا کی مختلف قوموں نے بندگی و نیازمندی کے اظہار کے لئے مختلف وضعیں اختیار کر لی تھیں۔ رومی گھٹنا ٹیک کر جھک جاتے اور بادشاہ کے قدموں یا دامن کو بوسہ دیتے۔ مصریوں کے لئے بھی ضروری تھا کہ [illegible] گھٹنے ٹیک کر زمین [illegible] بابل اور ایران میں سجدہ کی رسم پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اوندھے منہ ہو کر بالکل لیٹ جانے کی

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو حالت اِس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ کس وقت کی ہے؟ اُس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جاکر مقیم ہوئے تھے؟ یا اس وقت کی جب انکشاف حال کے بعد دوبارہ معتکف ہو گئے؟ مفسرین نے خیال کیا، اِس کا تعلق پہلے وقت سے ہے اور یہی بنیادی غلطی ہے جس نے سارا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اِس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے یعنی جب وہ ہمیشہ کے لئے غار میں گوشہ نشین ہو گئے اور پھر کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہو گئی تھی۔ "تحسبہم ایقاظا وھم رقود" میں "ایقاظا" سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے اور "رقود" سے مردہ ہونا۔ نہ کہ بیداری اور خواب۔ چنانچہ عربی میں زندگی و موت کے لئے یہ تعبیر عام و معلوم ہے

پھر یہ بات سامنے لانی چاہیئے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنہیں پیش آیا تھا۔ وہ عیسائی تھے صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہد و انزوا کی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترک علائق کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں معتکف ہو جاتے تھے۔ پھر ان پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ جو نشست کی جو حالت اختیار کر لیتے اسی میں پڑے رہتے، یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے تو برابر کھڑے رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس کی ابتدا اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کرلی۔ یعنی ابتداءً ان لوگوں نے مخالفوں کے ظلم وتشدد سے مجبور ہوکر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی پھر ایسے حالات پیش آ گئے کہ یہ اضطراری طریقہ زہد وتعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔

بہرحال معلوم ہوا کہ اصحابِ کہف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا ابتدا میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے تو زہد وعبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی لیکن وہ بدستور غار ہی میں معتکف رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا

انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر وعبادت کی جو وضع اختیار کرلی تھی وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتے نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا وہ پاسبانی کے لئے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا جب اس کے مالک مرگئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کرلی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر وتعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے، کوئی سجدے میں پڑا ہے، کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتا ہے۔ وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اٹھے

اور درندوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلے سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کرتا۔ چنانچہ ویٹیکان کے تہہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے اور اپنی اصل وضع و ہیئت پر باقی تھے

ابتدا میں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غار یا پرانی عمارتوں کے کھنڈر اختیار کئے گئے تھے لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہو گیا کہ خاص خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان میں آمد و رفت کے لئے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ جو جاتا تھا وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا صرف ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی رکھی جاتی تھی جو ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعے لوگ غذا بھی پہنچا دیتے

بعد کو جب مناسک ازم (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہو گئے تو اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہوتی گئیں۔ تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ازمنہ وسطیٰ تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان مقامات کو عام طور پر Logette کہتے تھے اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو ان پر یہ لاطینی الفاظ کندہ کر دیا جاتا کہ Ora Tu یعنی اس کے لئے دعا کرو

تاہم تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی اور اس کا بڑا مرکز مصر اور فلسطین تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی اور سینٹ بینی ڈکٹ (Benedict) نے سب سے پہلے اس کے قواعد و ضوابط منضبط کیے۔ سینٹ بینی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی

تھی جو بعد کو آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے کہ "تحسبہم ایقاظاً وھم رقود" یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں حتیٰ کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا اس لئے پہلے اس کی علت واضح کردی کہ جس غار میں معتکف ہوئے تھے وہ اس طرح کی غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا۔ کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی لیکن سورج کی تپش کا اس میں گذر نہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ روشنی اور ہوا ہے پس ہوا جلتی رہتی مگر تپش سے پوری حفاظت تھی وذالک من آیات اللہ

(ح) "ولبثوا فی کہفہم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا" (۲۵) کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ قل اللہ اعلم بما لبثوا؟ مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے۔ حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے اُن کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں۔ غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نو برس اور بڑھا دیئے۔ تم کہہ دو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے لوگوں کا قول ہے اور "سیقولون" سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اسی سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی ایسی ہی

یہ مروی ہے

(ط) امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ "او ذلک قوم

کیونکہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا۔ وہ زندہ انسانوں کا ہے

(۵) یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو۔ ہر بات اسطرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لئے صرف ایک کنجی کا انتظار تھا تحسبہم ایقاظاً وھم رقود" کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور دراز کار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیوں کہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالاکہ زندہ نہیں۔ "لو اطلعت علیہم لولیت فرارا ولملئت منہم رعبا" کی علت بھی سامنے آگئی اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن پر امام رازی مجبور ہوتے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ یقیناً دہشت کے مارے چیخ اٹھو گے اسی طرح "وتقلبہم ذات الیمین وذات الشمال" کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے۔ جیساکہ آیت "وتری الشمس اذا طلعت" سے متبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر اندر چلتی رہتی تھی۔ اور ان کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف رخ کرے۔

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۱۷ میں ہے اور کیوں اسے قدرت الٰہی کی ایک نشانی فرمایا کہ "ذالک من آیات اللہ"؟ معلوم ہو گیا کہ یہ دراصل اس بات کی تمہید

ذوالقرنین

فتوا و مدمو ا نند مدۃ طویلہ" یعنی اصحاب کہف کی موت پر ایک مدت گذر چکی ہے اُن کے اجسام فنا ہو گئے جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزوات میں بعض صحابہ کا گذر اصحاب کہف کی غار پر ہوا تھا اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیڑا میں پیش آیا تھا۔ مسیحی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ صدر بیان میں جو ارشادات کئے گئے ہیں ان کی تفصیلات کے لئے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہییں

The paradise or garden of The Holy Fathers by E. A-W. Budge

The Evolution of The Monastion deal by H. Workman.

Five Centuries of Religion by G - G. Coulton

The Medieval Mind. by H. O. Taylor

سورۂ کہف میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے۔ وہ ذوالقرنین کا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہوا کیوں کہ سورت مکی ہے

قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جاتے تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے کیونکہ فرمایا "ویسئلونک عن ذی القرنین"

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کے لئے ہو سکتا ہے اُس کے لئے فراہم ہو گیا تھا

ثالثاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں پہلے مغربی ممالک فتح کئے۔ پھر مشرقی پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا۔ جہاں پہاڑی درّہ تھا اور اس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

رابعاً اس نے وہاں ایک محکم سد تعمیر کر دی اور یاجوج و ماجوج کی

طرح کے تکلفات کرنے پڑے پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے اس لئے متاخرین کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے اور اگرچہ حسبِ عادت وہ تمام اعتراضات نقل کر دیئے ہیں جو اس تفسیر پر وارد ہوتے ہیں لیکن پھر حسبِ عادت ان کے بے محل جوابات پر مطمئن بھی ہو گئے ہیں حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا۔ نہ عادل تھا۔ نہ مفتوح قوموں کے لئے ذبانی تھا اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی

بہر حال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے۔

* * *

بند ہو گئی

خامساً وہ ایک عادل حکمراں تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم ملی، جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کرے گا لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بیگناہوں کے لئے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لئے ویسا ہی اجر بھی ہو گا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیئے جو جرم و بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں

سادساً وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا، یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور رہتے ہیں۔ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں۔ ہم خراج دیں گے تو اس نے کہا "ما مکنی فیہ ربی خیر" جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کروں گا۔ اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف و اعمال پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس لقب کا تھا۔ عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی سینگ کے ہیں پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینگوں والا۔ لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو۔ اس لئے مجبوراً "قرن" کے مختلف طرح

ہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا میں نے دیکھا کہ پچھم اتر اور دکن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ پچھم کی طرف سے ایک بکرا آ گے رو سے زمین پر پھر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا، اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے "

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی بادشاہت ہے اور بال والا بکرا یونان کی۔ جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور یہ چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر ایک شہنشاہی بننے والی تھیں اس لئے شہنشاہ مادہ و فارس کو دو سینگوں والے مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا یعنی سکندر مقدونی تھا جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا

دانیال نبی کا خواب

اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف ایک دَور کا اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی ایک خواب جو انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں دیکھا تھا

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لئے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت پامال ہو چکی تھی۔ اُن کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا۔ اُن کے شہر اجاڑ تھے۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس ہلاکت کے بعد اِن کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا، جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے شاہان بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہو گئے تھے۔ انہیں کی نسبت تورات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بیلشضر" شاہ بابل کی سلطنت کے تیسرے برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس خواب میں انہیں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔

چنانچہ کتابِ دانیال میں ہے۔

کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں اوپر خطِ میخی میں جو کتبہ کندہ تھا، اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے مگر جس قدر باقی رہ ہے وہ اس کے لئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے اس سے معلوم ہو گیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں کی دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک معقول اور عام تخیل تھا، اور یقیناً سائرس کو "ذوالقرنین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

دو سینگوں کا تخیل ابتداءً کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبیؑ کا خواب تھا یا بطور خود سائرس نے یا باشندگانِ پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں۔ تو سائرس سے لے کر ارتاززکسیز[۱] (اردشیر) اوّل تک، تمام

---

[۱] یاد رکھنا چاہیئے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں اور اس کی وجہ سے مؤرخین نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام غالباً گورو یا گوروش تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبۂ بے ستون سے معلوم ہوتا ہے لیکن یونانی اسے سائرس (Cyrus) کہنے لگے اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا۔ چنانچہ یسیعاہ ارمیا اور دانیال کے صحائف میں جا بجا یہ نام آیا ہے اور یہی گورش ہے جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی چنانچہ عرب اسے کیخسرو کے نام سے

اس خواب میں بنی اسرائیل کے لئے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی وخوش حالی کا نیا دور انہی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا یعنی شہنشاہ فارس بابل پر حملہ کر کے فتح مند ہونے والا تھا۔ اور پھر اسی کے ذریعے بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی چنانچہ برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا۔ اس نے میڈیا اور پارس کی مملکتوں کو ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لئے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تصور پیدا کر دیا گیا ہو یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا۔ اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا

اس انکشاف نے شک وتخمین کے تمام پردے اٹھا دیئے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو استخر (pasargadae) کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا۔ کہ اس کے دونوں طرف عقاب

شروع ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اِس عہد کے حالات معلوم کرنے کے سلئے براہ راست ذرائع معقود ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آ ئے ہیں، تمام تر یونانی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زیادہ معتمد بین مورخ ہیں ہیروڈوٹس (Herodotus) ٹی سیاز (Ctesias) اور زینوفن (Xenophon)

فتح ایران کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنی چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا وہ تمام تر پارسیوں کی قومی روایات پر مشتمل تھا ان روایات میں حملہ اسکندر سے پہلے کا زمانہ اِسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے۔ جس طرح ہندوستان میں پرانوں کے افسانے یا مہابھارت اور رامائن کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روایتیں تاریخی بنیادوں پر مبنی تھیں جب دقیقی اور فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنا چاہا تو انہیں عربی میں یہی مواد ملا اور اسی کو انہوں نے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ پس یہ تمام ذخیرہ قبل از اسکندر عہد کے لئے کچھ سودمند نہیں ہے اور سائرس کے حالات کے لئے ہمیں تمام تر یونانی مورخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت مسیح سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو ملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمالی مغربی میڈیا[1]۔ چوں کہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں اس لئے

---

[1] دارا کے کتبہ بے ستون میں اس کا نام مادا آیا ہے۔ اِس لئے میڈیا یونانی تلفظ سمجھنا چاہیے۔ عرب مورخوں نے اسے ماہات۔ سے تعبیر کیا ہے

شہنشاہان پارس انبیاء بنی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے اور اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے "ذوالقرنین" کا لقب پیدا ہو گیا ہو۔ بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ سائرس کو "ذوالقرنین" سمجھا جاتا تھا۔ اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اُسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو بہو تصویر ہے اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم وگمان بھی کیا جا سکے۔

زمانہ حال کے محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد حملہ اسکندریہ سے پہلے کا ہے۔ دوسرا پارتھوی یا ملوک الطوائف کا۔ تیسرا ساسانی سلاطین کا۔ فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے جو حملہ اسکندریہ سے پہلے گزرا اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے

پکارتے ہیں

سائرس کا لڑکا کیم بی سیز (Cambyses) ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ اس کا پارسی نام کبوجیہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر کیقباد کی شکل اختیار کر لی۔ شاہنامہ نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ کیونکہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کیقباد کے بعد دارا یوش ہوا۔ جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد ارٹازرکسیز ہے اسے تورات میں ارتخشستا کے نام سے یاد کیا ہے اور عربوں میں اردشیر مشہور ہو گیا

سائرس کا ظہور

لیکن ۵۵۹ قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت غیر معمولی حالات کے اندر اُبھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ گئیں یہ پارس کے " ایکے می نیز لہ" خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا جسے یونانیوں نے سائرس عبرانیوں نے خورس اور عربوں نے کیخسرو کے نام سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرماں روا ہو گیا اور اس طرح دونوں مملکتیں مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کر لی۔

لہ دارا نے بے ستون کے کتبہ میں اپنا سلسلۂ نسب ہخامنش نامی بادشاہ سے ملایا ہے۔ یہی ہخامنش یونانی میں (Achaemenes) ہو گیا۔ ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پڑدادا تھا۔ یعنی ایکے می نیز سے ٹیز پیز (چائش پش) پیدا ہوا۔ اس سے کم بی سیز (کمبوجیہ یا کیقباد) اوّل اور کم بی سیز سے سائرس۔ سائرس نے اپنے بڑے لڑکے کا نام بھی کم بی سیز رکھا تھا

قدرتی طور پر یہ ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں ملکتوں میں مختلف قبائل کے سرادر تھے جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے

۶۱۲ قبل مسیح میں جب نینوا تباہ ہو گیا اور آشوری فرماں روائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تو میڈیا کے باشندے آزاد ہو گئے اور بتدریج ایک قومی حکومت نشو ونما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امراء قبائل میں سے بھی بعض سرداروں کو سر اٹھانے کا موقع ملا اور حکمران خاندان پیدا ہو گیا۔ تاہم یہ دونوں ملکتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں اور بابل کی شہنشاہی جسے بخت نصر کی تہا رانہ فتمندیوں نے تمام ایشیا میں سر بلند کر دیا تھا، سب پر چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کئے ہوئے تھی۔

دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈیا سے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی و شمالی حصہ ہے جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا اور اس کی حکومت بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی جنگ میں سائرس فتح یاب ہوا لیکن رعایا کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی انہیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب جنگ کی حالت سے گذر رہا ہے البتہ کرئسیس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اس کے عزم و ہمت کی آزمائش کے لئے سائرس نے حکم دیا تھا چتا تیار کی جائے اور اسے جلا دیا جائے لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مردانہ وار چتا پر بیٹھ گیا ہے تو فوراً اس کی جان بخشی کر دی گئی اور اس نے بقیہ زندگی عزت و احترام کیساتھ بسر کی

اس جنگ کے بعد اسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ گیڈروسیا (مکران) اور بکٹریا (بلخ) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی۔ یہ مہم ۵۴۰ اور ۵۴۵ قبل مسیح کی درمیانی مدت میں واقع ہوئی ہو گی۔

تقریباً یہی زمانہ ہے جب باشندگان بابل نے اس سے درخواست کی ہے کہ بیل شازار (Belshazzar) [1] کے مظالم سے انہیں نجات دلائے

---

[1] دانیال نبی کی کتاب میں اسے جا بجا "بیلشضر" کے نام سے پکارا گیا ہے لیکن بابل کے کتبوں سے اس کا صحیح نام جو معلوم ہوا ہے یہی ہے علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ نوشتہ کے لکھنے والوں نے سائرس اور دارا کے دو مختلف حملوں کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا ہے اور کہیں سائرس کی جگہ دارا کا نام آگیا ہے کہیں دارا کی جگہ سائرس کا۔ تاریخی حیثیت سے جو واقعہ رونما ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بابل

پھر اُس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ فتوحات نہیں جو ظلم و قہر کی خونریزیوں کے ذریعے حاصل کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحرِ اسود سے لے کر بکٹریا (بلخ) تک ایشیاء کی تمام عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سربسجود ہو چکی تھیں

دنیا کی تمام غیر معمولی شخصیتوں کی طرح سائرس کے ابتدائی حالات نے بھی ایک پراسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کر لی ہے اور ہمیں اُس کی جھلک شاہنامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آ جاتی ہے اُس کا اٹھان زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا۔ بلکہ ایسے عجیب حالات میں جو ہمیشہ پیش نہیں آتے اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک غیر معمولی کرشمہ سنجی ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو اس کے نانا اسٹیاگس (Astyages) نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا۔ لیکن وہ ایک حیرت انگیز طریقے پر بچا لیا جاتا ہے اور اِس کی ابتدائی زندگی جنگلوں اور پہاڑوں میں بسر ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائل اسے ملک میں نمایاں کرتے ہیں اور اس کی خاندانی شخصیت پہچان لی جاتی ہے۔ اب اسے پورا موقع حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے لیکن اسے ایک لمحے کے لئے بھی اِس کا خیال نہیں گزرتا۔ حتیٰ کہ خود اسٹیاگس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا (Lydia) کے بادشاہ کروئیس (Croeses) سے تھی۔ لیکن تمام مؤرخین متفق ہیں کہ حملہ کروئیس کی طرف سے ہوا تھا اور اُس نے سائرس کو

مسخر کرنے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بایں ہمہ سائرس نے باشندگان بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور وہ آبہ کا تمام علاقہ فتح کرتا ہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔ چونکہ خود باشندگان شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے اور سائرس کے چشم براہ تھے اس لئے انہوں نے مزاحمت کا سامنا دیا۔ خود بابلی حکومت کا ایک سابق گورنر گوب ریاس (Gobryas) اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ اس شخص نے دریا سے نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے شہر فتح ہو چکا تھا۔

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح بنی اسرائیل کے لئے زندگی و خوشحالی کا نیا پیام تھا اور یہ ٹھیک اس طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہ نے ساٹھ برس پہلے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبی کی نہایت توقیر کی۔ یہودیوں کو یروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یروشلم میں اس کے لئے ایک ہیکل بناؤں (یعنی قدیم برباد شدہ ہیکل سلیمان کو از سر نو تعمیر کر دوں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کا ساز و سامان اس کے لئے مہیا کرنا چاہیے۔" اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو بنوکدرزار ہیکل سے لوٹ کر لایا تھا، بابل کے خزانے سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش بضر کے حوالے کر دیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور رکھ دیئے جائیں۔

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیاء میں مسلم ہو گئی

نینوا کی تباہی نے ایک نئی بابلی شہنشاہی کی بنیادیں استوار کر دی تھیں اور چونکہ رنزار (بخت نصر) کی قاہرانہ فتوحات نے تمام مغربی ایشیاء کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا حملہ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے وہ صرف بادشاہوں کو مسخر ہی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ قوموں کو غلام بنا تا اور ملکوں کو تباہ کر ڈالتا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جویانہ قوتوں کی جانشین ہوتی۔ اس کے بعد بابل کے مندروں کے پجاریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے) نابونی دس (Nabonidus) کو تخت نشین کیا تھا لیکن اس نے حکومت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا جو ظلم عیاشی کا مجسمہ تھا۔ اسی کی نسبت دانیال نبی کے صحیفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی اور ایک غیبی ہاتھ نے نمایاں ہو کر "منے منے تقیل اوفرسین" کے الفاظ دیوار پر لکھ دیئے تھے۔ (دانیال ۵:۱)

تمام مؤرخین متفق ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور ناقابلِ فتح کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی تہ در تہ اور اونچی تھی کہ اسے

پر فارس کے دو حملے ہوئے ہیں۔ پہلا سائرس نے کیا۔ دوسرا دارا نے سائرس نے بابل فتح کر کے اس کی اندرونی حکومت وطنی اُمرا کے ہاتھ چھوڑ دی تھی پھر تقریباً بیس برس بعد امراء بابل نے بغاوت کی اور دارا مجبور ہوا کہ دوبارہ بابل کو فتح کرے۔

کی کھڑکیاں کھلوا دوں اور دُہرے دروازے اِس کے لئے کھول دوں ہاں میں تیرے آگے چلوں گا میں ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کردوں گا میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ میں گڑے ہوئے خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے گنج تجھے عطا کروں گا اور یہ سب کچھ اس لئے کروں گا تاکہ تو جان لے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا ہے" (یسعیاہ ۴۵: ۲۴)۔

اِس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا چرواہا ہو گا اور میں نے اِسے اِس لئے پکارا ہے کہ بنی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اُسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے

اِس طرح یرمیاہ نبی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی :

" قوموں کے درمیان منادی کرو اور اسے مت چھپاؤ تم کہو بابل لے لیا گیا۔ لبعل رسوا ہوا۔ مردوک سراسیمہ کیا گیا اس کے بت خجل ہوئے۔ اِس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ اُتر سے ایک قوم ان پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے جو اُس کی سرزمین اجاڑ دے گی یہاں تک کہ اِس میں کوئی نہیں رہے گا" (۵۰: ۱)۔

یرمیاہ نبی نے اس کی بھی پیشین گوئی کردی تھی کہ ستر (۷۰) برس تک یہودی بابل میں قید رہیں گے اور اِس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہو گی۔

" خداوند کہتا ہے: جب بابل پر ستر (۷۰) برس گذر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا تب تم مجھے پکارو گے اور میں جواب دوں گا تم مجھے

۵۴۲ ق م میں صرف اسی کی تنہا شخصیت عظمت وحکمرانی کے عالمگیر تخت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گمنام انسان تھا لیکن اب ان تمام مملکتوں کا تنہا فرمانروا ہے جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندیوں کا مرکز رہ چکی ہیں فتح بابل کے بعد وہ تقریباً دس برس تک زندہ رہا اور ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال کر گیا۔

اب قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت کے بارے میں کیا تھیں، اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح وہ حرف بحرف پوری ہوئیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی ہے۔ جن کا ظہور سائرس کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا انہوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہے کہ بابل کے ہاتھوں ظہور میں آئے گی اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے اور اس سلسلہ میں خورس (سائرس) کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

"خداوند تیرا نجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ ..... یروشلم پھر آباد کیا جائے گا۔ یہودا کے شہر بنائے جائیں گے میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کر دوں گا .... میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری ساری مرضی پوری کرے گا

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا۔ تاکہ قوموں کو اس کے تابع میں کر دوں اور بادشاہوں

کی طرح خورس کا نام نہ بتلایا گیا ہو صرف قوم و ملک کا ذکر ہو اور یہود کو یہ نام بڑھا دیا گیا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد برابر یہی رہا کہ سائرس کا ظہور نبیوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہوا تھا۔ اور وہ خدا کی ایک برگزیدہ ہستی تھی جو اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ مظلوموں کی دادرسی ہو اور بابلیوں کے ظلم و شرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

قرآن کی تصریحات اور سائرس

اب غور کرو۔ قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے، وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس مبحث کے آغاز میں تصریحاتِ قرآنی کا خلاصہ دے دیا ہے جو سات نکات پر مشتمل ہیں۔ ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

ڈھونڈو گے اور مجھے پالو گے ـــــ میں تمہاری اسیری ختم کر دوں گا
تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا" (۲۹ : ۱۰)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اس کی رحمت کا ظہور ہوگا جو بنی اسرائیل پر پھر لوٹ آئے گی۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو دانیال نبی نے (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہو گئے تھے) اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھلائی کہ ایک سو ساٹھ برس پہلے اس کے ظہور کی خبر دے دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اسی کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے تعمیر ہیکل کے لئے جاری کیا۔

زمانہ حال کے نقاد ان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھا دی گئی ہوں۔ بخصوصاً یسعیاہ کی پیشین گوئی جس میں صریح خورس (سائرس) کا نام موجود ہے لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے اور محض عقلی استغراب ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا۔ جن کی نسبت یقین کیا گیا کہ الہام سے لکھے گئے تھے علاوہ بریں تورات کے آخری صحائف جو فتح بیت المقدس کے اثنا میں یا اسیری بابل کے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کر لئے گئے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت سے برابر یہودیوں میں متداول رہے۔ اور کوئی حادثہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ ان کے نسخے نابود ہو گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں بھی دانیال نبی کے خواب

کبھی انسان کی کسی کامرانی وخوشحالی کو براہ براست خدا کی طرف منسوب کرکے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا ہے، تو اس سے مقصد عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل وکرم سے ظہور میں آئی ہو۔ مثلاً حضرت یوسف کی نسبت فرمایا "کذالک مکنا لیوسف فی الارض" ۵۶:۱۲ اس طرح ہم نے سرزمینِ مصر میں یوسف کو حکومت دے دی "ہم نے دے دی" کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کو ہر طرح کے ناموافق حالات میں محض فضلِ الٰہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہو گئی تھی یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں آئی ہو پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں اور انہیں محض توفیقِ الٰہی کی کرشمہ سازی سمجھا جاسکے۔ کیوں کہ اس کے تمکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دے دی۔ قبل اس کے کہ پیدا ہو، خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہشمند ہو گیا تھا۔ ایک وفادار آدمی اس کی زندگی بچاتا ہے اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گمنام گڈریئے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے پھر یکایک نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی جنگ و مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لئے خالی ہو جاتا ہے! یقیناً یہ صورت حال واقعات وحوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو۔ یہ ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے، اور صاف نظر آرہا تھا کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے

(۱) سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جا سکتی تھی تو صرف سائرس ہی کی تھی نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق، دانیال نبی کے خواب کا ظہور، رحمتِ الٰہی کی واپسی کی بشارت بنی اسرائیل کا نجات دہندہ خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ! پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو؟۔

سدی کی ایک روایت میں بھی جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے: قال، قالت الیہود: "اخبرنا عن نبی لم یذکرہ اللہ فی التورات الا فی مکان واحد" قال: و من؟ قالوا: ذوالقرنین۔ یعنی یہودیوں نے آنحضرت سے کہا: اس نبی کی نسبت ہمیں خبر دیجیے جس کا نام تورات میں صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے آپ نے فرمایا۔ وہ کون؟ کہا: ذوالقرنین۔ چونکہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال نبی کے خواب ہی میں آیا ہے۔ اس لیے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس اور مادہ کے مملکتوں کے اجتماع و اتحاد کی علامت تھی۔

(۲) اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ۔ سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے، یہ ہے کہ "انا مکنا لہ فی الارض و آتیناہ من کل شیٔ سببا" (۸۴) ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ قرآن جب

باہمی ملالت بھلا دیئے۔ وہ سائرس کی یہ کامرانی برداشت نہ کر سکا کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہے اس نے پہلے بابل، مصر اور اسپارٹا کی مملکتوں کو اس کے خلاف ابھارا اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پیٹریا (Pteria) پر قبضہ کر لیا۔

اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف وہ اس حملہ کا مقابلہ کرے وہ میڈیا کے دارالحکومت ہگمتانہ[1] سے (جو اب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے) نکلا، اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد جو پیریا اور سارڈیس کے قریب واقع ہوئی تھیں لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا

ہیرو ڈوٹس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں لیکن یہ موقع ان کا نہیں وہ کہتا ہے سائرس کی فتح مندی ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پیریا کے معرکہ کے بعد صرف چودہ دن کے اندر لیڈیا کا مستحکم دارالحکومت مسخر ہو گیا اور کروسس ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے سائرس کے آگے سرنگوں کھڑا تھا

اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے لے کر بحر اسود تک اس کے زیر نگیں تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اسی طرح رک گئے جس طرح بارہ سو سال بعد طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے فتمند

---

[1] دارا کے کتبوں میں اس کا نام یہی آیا ہے مگر ہیرو ڈوٹس وغیرہ یونانی مورخین نے اسے اک بتانا لکھا ہے (Achatana) اور یہی نام یورپ میں مشہور ہو گیا تھا

(۳) اس کے بعد اس کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے۔ ایک مغرب الشمس[۵] کی جانب یعنی پچھم کی طرف۔ ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف۔ تیسری ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یاجوج ماجوج وہاں آ کر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔ اب دیکھو یہ تمام تصریحات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

مغربی مہم

اوپر پڑھ آئے ہو کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ اسے ایشیائے کوچک کے بادشاہ کروسس نے حملہ کر دیا۔ ایشیائے کوچک کی یہ بادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور ہوئی پچھلی صدی سے ابھر رہی تھی۔ اس کا دارالحکومت سارڈیس (Sardis) تھا۔ سائرس کی تخت نشینی سے پہلے لیڈیا اور میڈیا میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بالآخر کروسس کے باپ نے سائرس کے نانا استیاگس سے اپنے صلح کر لی، اور باہمی اتحاد کے استحکام کے لیے باہمی ازدواج کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ لیکن کروسس نے یہ تمام عہد و پیمان اور

---

۵ یاد رہے کہ پچھم اور پورب کے لیے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر تورات میں بھی جابجا آئی ہے۔ مثلاً ذکریا نبی کی کتاب میں ہے: "رب الافواج فرماتا ہے: میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک اور اس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑا لوں گا" (۸: ۷)

یہ ظاہر ہے کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں، لیکن ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں، تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تھالی آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔

مشرقی مہم

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی۔ چنانچہ ہیروڈوٹس اور ٹی سیاز[1] دونوں اس کی مشرقی لشکر کشی کا ذکر کرتے ہیں جو لیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی۔ اور دونوں نے تصریح کی ہے کہ "مشرق کے بعض وحشی اور صحرا نشین قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی" یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس اشارہ کی تصدیق ہے کہ "حتیٰ اذا بلغ مطلع الشمس وجدھا تطلع علیٰ قوم لم نجعل لھم من دونھا ستراً" (۹۰) جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی۔ یعنی خانہ بدوش قبائل تھے

---

[1] ٹی سیاز (Ctesias) ایک یونانی تھا جو ۳۹۸ قبل مسیح سے لے کر ۴۱۴ ق م تک شہنشاہان پارس کا درباری طبیب رہا اور اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور تاریخ لکھی۔ بعد کے تاریخ مورخوں نے اس کے بعض بیانات شبہ کی نگاہ سے دیکھے ہیں اور اس لئے اُسے استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو ہیروڈوٹس (المتولد ۴۸۴ ق م) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے مگر موجودہ زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے

قدموں کے لئے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں روک نہ ہو سکیں۔ اس نے فارس سے تاکے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن سمندر کی موجوں پر چلنے کے لئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حدِ نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا، اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔

یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی، صریح مغرب کی لشکر کشی تھی کیوں کہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لئے مغرب الشمس کی آخری حد تھی

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو۔ تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی سی شکل دے دی ہے۔ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور اس کا محل موجودہ سمرنا سے بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھا پس جب سائرس سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہو گا تو یقیناً بحر ایجین کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہو گا۔ جو سمرنا کے قرب و جوار میں واقع ہے یہاں اس نے دیکھا ہو گا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ ساحل کی کیچڑ سے پانی گدلا ہو رہا ہے اور شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے اسی صورتِ حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ "وجدہا تغرب فی عین حمئۃ" (۸۶:) اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے

وجد من دونہما قوما لا یکادون یفقہون قولاً (۹۳) یہاں تک کہ وہ دو (پہاڑی) دیواروں
کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس طرف اسے ایک قوم ملی جو کوئی بات بھی نہیں
سمجھ سکتی تھی پس معلوم ہوتا ہے "سدین" سے مقصود کاکیشیا کا پہاڑی درّہ
ہے کیونکہ اس کے داہنی طرف بحر خزر ہے جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک
دی ہے بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کے لیے قدرتی روک ہے
درمیانی علاقے میں اس کا سرتاپا سلسلہ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا
ہے پس اگر شمالی قبائل کے حملوں کے لیے کوئی راہ باقی رہی تھی، تو وہ صرف اس
سلسلہ کوہ کا ایک عرض یعنی درّہ یا وسطی وادی تھی اور یقیناً وہیں سے یاجوج ماجوج
کو دوسری طرف پہنچنے کا موقع ملتا تھا اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف
بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا بلکہ سمندروں اور پہاڑوں
کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے
لیا اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران، شام، عراق
عرب، ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو
گیا تھا۔

نقشہ میں یہ مقام دیکھو۔ تمام مغربی ایشیا نیچے ہے۔ اوپر شمال میں
بحر خزر ہے اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے درمیان
میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا
کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان دو سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں
میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے اب اس روک میں اگر کوئی شگاف
رہ گیا تھا جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس روک کو لانگ سکتے ہیں۔ تو وہ

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مؤرخین کی صراحت کے مطابق بکٹریا یعنی بلخ کے علاقے کے قبائل تھے نقشہ پر اگر نظر ڈالی جائے گی تو صاف نظر آجائے گا کہ بکٹریا ٹھیک ٹھیک ایران کے لئے مشرقی اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیڈروسیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلا رکھی تھی اور ان کی گوشمالی کے لئے اسے نکلنا پڑا۔ گیڈروسیا سے مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے۔
اس سلسلے میں ہندوستان کی طرف کہیں کوئی اشارہ نہیں ملتا اس لئے قیاس کہتا ہے کہ مکران سے نیچے اس کے قدم نہیں اُترے ہوں گے اور اگر اترے ہوں گے تو دریائے سندھ سے آگے نہیں بڑھے ہوں گے کیونکہ دارا کے زمانہ میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

شمالی مہم

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے۔ یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاسپین) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (Caucasus) کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا اور وہاں اسے ایک درّہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا اسی راہ سے یاجوج ماجوج آکر اس طرف کے علاقے میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔
قرآن نے اُس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ حتیٰ اذا بلغ بین السدین

(۴) اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے، وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی فیاضیانہ سرگرمی ہے، اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مؤرخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اُٹھ ہی نہیں سکتی۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی، اس کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا: "یاذاالقرنین! اما ان تعذب، واما ان تتخذ فیہم حسناً (۸۶) یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے خواہ سزا دے، خواہ انہیں اپنا دوست بنا لے۔ یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے بادشاہ کروئسس نے تمام عہد و پیمان اور باہمی رشتہ داریاں بھلا کر بلاوجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ وقت کی تمام طاقتور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اب جب تائیدِ الٰہی نے اپنا ثمر دکھایا اور تمام لیڈیا مسخر ہو گیا۔ تو حکم الٰہی ہوا یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ کر سکتا ہے کیونکہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ تائیدِ الٰہی نے تیرا ساتھ دیا۔ دشمنوں کو مسخر کر دیا۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں، لیکن تجھے بدلہ نہیں لینا چاہیئے۔ وہی کرنا چاہیے جو نیکی اور فیاضی کا مقتضا ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی کیا "قال اما من ظلم فسوف نعذبہ ثم یرد الی ربہ فیعذبہ عذابا نکرا" "واما من اٰمن وعمل صالحاً فلہٗ جزاء الحسنیٰ وسنقول لہٗ من امرنا یسرا" (۸۸) اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دینی چاہتا۔ میری جانب سے عام بخشش کا اعلان

صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔ ذوالقرنین نے اسے بھی بند کر دیا، اور اس طرح شمالی اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح مقفل ہو گیا
باقی رہا یہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی اور جو بالکل ناسمجھ تھی، وہ کون سی قوم تھی؟ تو اس سلسلہ میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں، اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے پہلی قوم وہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے "کاسپین" کے نام سے پکار اہے، اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام بھی "کاسپین" پڑ گیا ہے دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر عین کاکیشیا کے دامن میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے "کوچی" یا "کول شی" کے نام سے پکارا ہے، اور دارا کے کتبہ اسطر میں اس کا نام "کوشیہ" آیا ہے [1]۔ ان ہی دو قوموں میں سے کسی نے یا دونوں قوموں نے ذوالقرنین سے یاجوج ماجوج کی شکایت کی ہو گی اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں، اس لئے ان کی نسبت فرمایا کہ — لایکادون یفقہون قولا —!

---

[1] دارایوس اول کا یہ کتبہ تاریخ قدیم کا ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ اس میں اس نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور زیر حکومت صوبوں کے نام گنا دیئے ہیں جو تعداد میں ۲۸ ہیں۔ ان میں سے اکثر ناموں کا جغرافیائی محل روشنی میں آچکا ہے صرف ایک دو ناموں کی حقیقت اب تک محل غور و بحث ہے —!

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سائرس کی فتح۔ یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی۔ کیونکہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کروئسس کو نہ بچا سکے، حالانکہ حملہ سے پہلے اس نے مندروں کے ہاتف[1] سے استصواب کر لیا تھا، اور ڈلفی کے ہاتف نے فتح و کامرانی کی بشارت دی تھی۔ پس قدرتی طور پر واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کے لیے خوشگوار نہ ہو سکی اور اس امر کی کوشش شروع ہو گئی کہ اس شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی فتحمندی کی شان پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کروئسس کا معاملہ اچانک ایک پر اسرار افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یونانی دیوتا اپنے سارے معجزوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس[2] نے

---

[1] ہم نے (Oracle) کے لئے ہاتف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگرچہ اس کے لئے مترادف لفظ نہیں ہے لیکن اصطلاح کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کرتا ہے۔
یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتف غیبی کی صدائیں سنی جاتی ہیں اور خاص پجاریوں پر دیوتاؤں کا الہام ہوتا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے اور غیب اور دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سنا دیتے۔

---

[2] ہیروڈوٹس مترجمہ اے ڈی کاڈلی
Lued edition (Godley)

ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی برائی کرے گا۔ بلاشبہ اسے سزا دوں گا پھر اسے مرنا ہے اور آخرت کا عذاب سخت جھیلنا ہے اور جو لوگ میرے احکام مانیں گے اور نیک کردار ثابت ہوں گے تو اُن کے لئے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہوگا اور وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائیں گے۔ پس بندگان خدا پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو بہو اس طرزِ عمل کی تعبیر ہے جس کی تفصیل ہمیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے، اور جسے زمانہ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ تاریخی حقیقت تسلیم کر لیا ہے

تمام یونانی مؤرخین بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمنوں کے ساتھ سختی کرتا تو یہ انصاف ہوتا کیونکہ زیادتی ان ہی کی تھی لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا اس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا ہیروڈوٹس لکھتا ہے۔ کہ سائرس نے اپنی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن کی فوج کے علاوہ اور کسی انسان پر ہتھیار نہ اٹھائیں، اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے کروسس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں بھی اسے گزند نہ پہنچائی جائے اگر وہ مقابلہ کرے، جب بھی اس پر تلوار نہیں اٹھانی چاہیئے۔ اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی کہ باشندوں کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا ایک فرمانروائی خاندان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کروسس کی جگہ سائرس نے لے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا۔

نہ یادہ قوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ خود ہیروڈوٹس کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے، اور یونانی افسانہ میں اپالو کے معجزہ کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکار کر دی تھی یونانی افسانہ نے اس کا توڑ کرنے کے لئے اپالو کا معجزہ گڑھ لیا

قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کرے گا، سزا پائے گا، جو حکم مانے گا اور نیک عمل ہوگا اسے انعام ملے گا۔ لعینہٖ زینوفن کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں کہا ہے کہ "وسنقول لہ، من امرنا یسرا" اگر لوگوں نے نیک عمل اختیار کی، تو دیکھیں گے میرے احکام و قوانین میں انکے لئے سختی نہ ہوگی۔ تمام مؤرخین بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لئے سرتاسر شفقت و رحمت تھا۔ اس نے ان تمام بوجھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے، اس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کئے وہ زیادہ سے زیادہ نرم اور زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے

(۵) یہ تو صرف اس کی مغربی فتح مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا ہے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے؟

لیکن قبل اس کے کہ ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں، یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ یونانی مؤرخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے، ہم وطن نہیں تھے، ہم مذہب نہیں تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی، اور لیڈیا کی شکست یونانی، قومیت، یونانی تہذیب

لیڈیا کے باشندوں کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈلفی کے ہاتف کا جواب غلط نہ تھا، مگر کروئسس نے جنگ کے جوش و طلب میں اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھا۔ ہاتف نے کہا تھا " اگر اس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی مملکت تباہ کر دے گا " یعنی خود اپنی مملکت تباہ کر دے گا، مگر اس نے خیال کیا بڑی مملکت سے مقصود پارسیوں کی مملکت ہے۔ نیز وہ کہتا ہے: پہلے سائرس نے حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چتا تیار کی جائے اور اس پر کروئسس کو بٹھا کر آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ لیکن پھر جب کروئسس کی بعض باتیں سنیں تو بے حد متاثر ہوا، اور آگ بجھانے کا حکم دیا لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو گئی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اسے فوراً بجھا دیا جائے یہ حال دیکھ کر کروئسس نے اپالو دیوتا کو پکارا، اور باوجودیکہ آسمان بالکل صاف تھا اچانک بارش شروع ہو گئی اور اس طرح اس معجزے نے بروقت ظاہر ہو کر اس کی جان بچالی

لیکن خود ہیروڈوٹس اور زینوفن کی تصریحات سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کروئسس کے عزم و صبر کا امتحان لینا چاہتا تھا یا یہ بات آشکار کر دینی چاہتا تھا کہ یونانیوں کے خود ساختہ دیوتا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے اور جن دیوتاؤں کی موہوم بشارت پر اعتماد کر کے جنگ کی گئی تھی ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچالیں۔ یعنی مقصود یہ تھا کہ پہلے اسے چتا پر بٹھایا جائے۔ آگ بھی لگا دی جائے لیکن وہ جب خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر اسے بخش دے، اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جائے۔ دوسری علت

کہ ظلم سے نجات دلائے، درماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے غم زدوں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفتوں کے ساتھ عاجزی اور انکساری اس کے حسن کمال کا سب سے بڑا زیور تھی اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر جس کے آگے تمام قوموں کے سر جھک گئے تھے اور ایک ایسے خزانے کا مالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی۔ کبھی گوارا نہ کیا کہ فخر و غرور کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔"

ہیروڈوٹس لکھتا ہے:

" وہ ایک نہایت مخیر بادشاہ تھا۔ اسے دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی، بلکہ جود و سخاوت کا جوش تھا۔ وہ کہتا تھا: سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ نوع انسانی کی بھلائی کا موقع ملے اور مظلوموں کی دادرسی ہو۔"

ٹی سیاز لکھتا ہے:

"اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے چنانچہ اس کی اسی فیض رسانی نے اس کی تمام رعایا کے دل اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ وہ اس کے لئے بخوشی خوشی اپنی گردنیں کٹوا دیتے۔"

سب سے زیادہ نمایاں بات جو ان تمام مؤرخوں کے صفحات پر ملتی ہے وہ سائرس کی شخصیت کی غیر معمولی نمود ہے سب کہتے ہیں کہ وہ جس

اور سب سے زیادہ یہ کہ یونانی مذہب کی شکست تھی پھر سائرس نے جانشینوں کے نے براہِ راست یونانیوں کو زیر کیا تھا اور ہمیشہ کے لئے دونوں قومیں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سرائی کا شائق ہوگا تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکوتی صفات کی مدحت سرائی میں رطب اللسان ہے، اور اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالمگیر اعتراف و تاثر کی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ دوست و دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ سب کے دلوں میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سرائی تھی، اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑے۔

دلیحۃ شہدت بہا ضرتہا
والفضل ما شہدت بہ الاعداء

زینوفن لکھتا ہے

"سائرس ایک نہایت دانشمند، سنجیدہ اور ساتھ ہی ادلوالعزم تھا اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ اس کی شوکت وحشمت سے کہیں زیادہ اس کی عالی حوصلگی اور سیر چشمی تھی اور اس کی فیاضی اور رحمدلی اپنی کوئی دوسری مثال نہیں رکھتی۔ انسان کی خدمت اور ہمدردی اس کی شاہانہ طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زدہ انسانوں کی خبر گیری کرے، مظلوموں کو

مستحکم ہونے والی تھی۔ اس کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خالی رہ گیا تھا
اس کے فرزند کیقباد نے اسے بھی بھر دیا اور پھر چند برسوں کے بعد
دنیا کی وہ عالمگیر سلطنت ظہور میں آ گئی۔ جو ایشیاء افریقہ اور یورپ کے
اٹھائیس ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس پر سائرس کا جانشین دارائوش
تن تنہا حکمراں تھا۔

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں جنھیں قہر و طاقت
نے سر کیا تھا۔ لیکن سائرس کی فتوحات روح و دل کی فتوحات تھیں جنھیں
انسانیت اور فضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سر اٹھاتی ہے لیکن ٹک نہیں
سکتی۔ دوسری ٹک جاتی ہے اور پھر ٹلتی نہیں۔

سائرس فتح بابل کے بعد دس برس تک زندہ رہا۔ اب اس کی حکومت
عرب سے لے کر بحر اسود تک اور ایشیائے کوچک سے بلخ تک
پھیلی ہوئی تھی، اور ایشیا کی تمام قومیں اس کے ماتحت آ چکی تھیں، لیکن
تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بغاوت اور سرکشی کا ایک حادثہ بھی
نہیں ہوا، کیونکہ زینوفن کے لفظوں میں "وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ انسانوں
کا شفیق مربی اور قوموں کا رحیم باپ تھا" اور رعایا سخت گیر حکمرانوں سے بغاوت
کرسکتی ہے لیکن اولاد اپنے شفیق باپ سے باغی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانے
کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی، یہ ایسی
خصوصیت تھی جو آگے چل کر رومن ایمپائر کو بھی نصیب نہ ہوئی

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد کے بادشاہوں کی سخت گیری
قساوت قلبی، اور ہیبت انگیز طریق تعذیب کی چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی سائرس

عہد میں پیدا ہوا؟ اس کی مخلوق نہیں تھا۔ ایک بااثر شخصیت تھی جسے قدرت نے اپنا کرشمہ دکھانے کے لئے نمودار کر دیا تھا۔ دنیا کے کسی حکیم نے اِس کی تربیت نہیں کی۔ وقت کے متمدن ملکوں میں سے کسی ملک میں اس کی پرورش نہیں ہوئی۔ وہ محض قدرت کا پروردہ تھا، اور قدرت ہی کے ہاتھوں سے اسے اٹھایا تھا۔ اِس کی تمام ابتدائی زندگی صحراؤں کی گود اور پہاڑوں کی آغوش میں بسر ہوئی وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چرواہا تھا۔ تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چرواہا جب دنیا کے سامنے آیا، تو حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ، دانش کا سب سے بڑا پیکر فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ اِن کے سامنے تھا۔

سائرس اور سکندر

سکندر اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے تیار کیا تھا اور بلاشبہ وہ بہت بڑا فاتح نکلا۔ لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کر سکا؟ سائرس کے لئے ہمیں کوئی ارسطو نہیں ملتا اِس نے انسانی حکمت کی درس گاہ کی جگہ قدرت کی درسگاہ میں پرورش پائی تھی، تاہم اس نے سکندر کی طرح صرف ملکوں ہی کو نہیں بلکہ انسانیت و فضائل کی مملکتوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔

سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اِس سے زیادہ نہ تھی، جتنی خود اُس کی عمر تھی، لیکن سائرس کی فتوحات نے جو اینٹیں چُن دی تھیں، وہ دو سو برس تک نہ ہل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اِس کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن سائرس نے جب دنیا چھوڑی تو اِس کی مملکت روز بروز وسیع و

شہنشاہوں کی بدعملیوں کے مقابلے میں لائی جاتی ہے تو پھر اس کی شریفانہ نمود اور زیادہ درخشندہ ہوجاتی ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

بہر فی الحقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی بارہ برس پہلے وہ ایک چھوٹی سی ریاست افشان کا ایک گمنام رئیس تھا اور اب ایشیا کی وہ تمام مملکتیں اس کے زیر فرمان تھیں جہاں پچھلی قوموں کی بڑی بڑی عظمتیں ظہور میں آچکی تھیں۔ ان تمام بادشاہوں میں جنہوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے کئے، ایک بادشاہت بھی ایسی نہ تھی۔ جو اب اپنی ہستی کا کوئی موثر ظہور رکھتی ہو سے اکاڈی مملکت کے نیم اصنامی سارگون سے لے کر بخو کدرراز (بخت نصر) تک سب کی مملکتیں اس کے آگے سربسجود ہوگئی تھیں وہ صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا وہ ایک بڑا حکمراں تھا۔ قوموں نے یہ نیا دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کا استقبال کیا۔ ان دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گزرے اس کی تمام وسیع مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی نظر نہیں آتا۔ بلاشبہ اس کی رعایا پر اس کی طاقت کا رعب چھایا ہوا تھا، لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کی سخت گیری سے ہراساں ہو۔ اس کی حکومت قتل وصلب کی سزاؤں سے بالکل ناآشنا رہی۔ اب تازیانوں سے مجرموں کو نہیں پیٹا جاتا تھا۔ اب قتل عام کے احکامات صادر نہیں ہوتے تھے۔ اب قوموں اور قبیلوں کو جلاوطن نہیں کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس

قدیم تاریخ کی سب سے بڑی شخصیت ہے جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمانروائی کی عظمت، اور اخلاق و انسانیت کی فضیلت جمع ہو گئی تھی اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا، اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات تھی

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی. بی. گرنڈی (G. B. Grundy) جو موجودہ زمانے میں تاریخ قدیم کے ایک مستند ماہر ہیں اور جن کی کتاب گریٹ پرشین وار (Great Persian War) نہایت مقبول ہو چکی ہے، لکھتے ہیں

"یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ سائرس کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ اُس نے اپنی تمام معاصر قوتوں کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کر دیا۔ اس کی ابتدائی نشو ونما بالائی فارس کے غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی۔ جس کی سرگزشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینوفن نے مدوّن کیں جو سقراط کا شاگرد تھا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کے فضائل انسانیت کا جوہر عام طور پر نمایاں ہے خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں، خواہ نہ دیں۔ تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اس کے تدبّر و سیاست کا دامن اس کی انسانیت و فضیلت کے جوہر سے بندھا ہوا تھا، اور جب یہ خصوصیت آشوری و بابلی

گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا۔ اب دیکھو اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر نجات دہندہ کی شخصیت تھی یا نہ تھی؟

جب ہم اِس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سائرس کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو یہ اوّل نظر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اُس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا جس کے لئے وقت کی تمام قوتیں چشم براہ ہوں۔ قوموں کا انتظار ان کی زبانوں پر نہیں ہوتا۔ ان کے حالات کے تدریجی تقاضے میں ہوتا ہے غور کرو، اس عہد کی رفتارِ زمانہ کا قدرتی تقاضا کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صبح تمدن کی وہ مود تھی جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اِس وقت تک انسانی فرمانروائی کی عظمت صرف قہر و غضب ہی کی نقاب میں رونما ہوئی تھی، اور سب سے بڑا حکمران وہی سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ انسانوں کے لئے خوفناک ہو۔ آشور بنی پال نینوا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، اس لئے کہ وہ شہروں کے جلانے اور آبادیوں کے ویران کرنے میں سب سے زیادہ بے باک تھا۔ بابل کی نشاۃ ثانیہ میں بنوکدنزا سب سے بڑا فاتح تھا۔ اِس لئے کہ قوموں کی ہلاکت اور مملکتوں کی ویرانی میں سب سے زیادہ مہربان تھا۔ مصریوں، اکادیوں، ایلامیوں، آشوریوں، اور بابلیوں سب میں انسانی حکومت و عظمت کے مظاہر خوفناکی اور دہشت انگیزی کے مظاہر تھے۔ اور ان کی شخصیتوں نے دیوتائی الوہیت کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہولناک استحقاق حاصل کر لیا تھا۔ سائرس کے

کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے آشوری اور بابلی بادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات یک قلم محو کر دیئے۔ جلاوطن قومیں اپنے وطنوں میں لوٹائی گئیں، ان کے معبد اور معبود انہیں واپس دے دیئے گئے، قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جبر و تشدد باقی نہیں رہا۔ ہر قوم کے ساتھ پوری طرح داد رسی کی گئی ہر مذہب کے پیروؤں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی دنیا کی گزشتہ عالمگیر دہشت تاکی کی جگہ ایک عالمگیر رواداری اور عفو و بخشش کا مبارک دور شروع ہو گیا" ؎۵

غور کرو قرآن نے چند لفظوں کے اندر جو ارشادات کر دیے ہیں آج تاریخ کا داستان سرا کس طرح اس کے ایک ایک حرف کی شرح و تفصیل سنا رہا تھا

(۶۱) اب چند لمحوں کے لئے ان تصریحات پر غور کرو جو تورات کے صحائف میں مندرج ہیں۔ کس طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت واضح کر رہے ہیں، اور کس طرح قرآن کے ارشادات بھی ٹھیک ٹھیک اُن کی تصدیق ہیں؟ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے کہ: "خداوند کہتا ہے: خورس میرا چرواہا ہے" اور پھر یہ بھی کہا کہ " وہ میرا مسیح ہے" اور یرمیاہ نبی کا بیان اوپر

؎۵ پروفیسر موصوف کے اس مقالہ کے لئے یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ کی دوسری جلد صفحہ ۸۵۰ کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو جے اے ہمرٹن J. A. (Hammerton) نے مرتب کی ہے اور حال میں شائع ہوئی ہے

غور کر دلیسعیاہ نبی کا یہ جملہ صورت حال کی کیسی ہو بہو تصویر ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہو گا"، "وہ میری ساری رضی پوری کرے گا۔ میں اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کے قوموں کو اُس کے قابو میں دے دوں گا اور بادشاہوں کی کمریں اس کے آگے کھلوا ڈالوں گا میں اس کے آگے چلوں گا۔ ٹیڑھے راستے اس کے لئے سیدھے کر دوں گا" سارے مؤرخ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک چرواہے کی طرح آیا اور اس نے بندگانِ خدا کی رکھوالی کی۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رخ کیا، اس کی شقاوت ختم ہو گئی، وہ جس قوم کی طرف بڑھا اس کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ اُس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا اس کے سارے بوجھ ہلکے ہو گئے۔ وہ صرف بنی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ تمام قوموں کا نجات دہندہ تھا۔

یاد رہے کہ یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی میں اسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے اور تورات کی اصطلاح میں "مسیح" وہ ہوتا ہے جسے خدا اپنی برکتوں کے ظہور کے لئے برگزیدہ کر لے، اور خدا کے براہ راست ممسوح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤد کی نسبت بھی آیا ہے کہ "مسیح" تھے۔ سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کے لئے ایک آخری مسیح کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ سائرس کو "مسیح" کہنا بلا شبہ اس کے تقدس اور الٰہی برگزیدگی کی سب سے زیادہ واضح اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے

۷ اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے۔ وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں کہ وہ ایک خدا پرست انسان تھا۔ آخرت پر یقین رکھتا تھا، احکامِ الٰہی کے مطابق عمل کرتا تھا اور اپنی

ظہور سے پچاس برس پہلے بنوکدنضر کی شہنشاہی کا ظہور ہوا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیت المقدس پر پیہم تین حملے کرکے نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا زرخیز علاقہ تاراج و ویران کر دیا، بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کو اس طرح ہنکا کر بابل لے گیا کہ جوزیفس کے لفظوں میں "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا۔" پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضا یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کے لئے چشم براہ ہو؟ قریب ایک نجات دہندہ کی تلاش کر رہی ہو؟ ایک ایسے نجات دہندہ کی جو انسانوں کے گلے کے لئے خدا کا بھیجا ہوا "چرواہا" ہو، جو ان کی بیڑیاں کاٹے اور ان کے سروں کا بوجھ ہلکا کر دے، جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دے کہ انسانی حکمرانی نوع انسانی کی خدمت کے لئے ہونی چاہیئے۔ دہشت انگیزی اور خونخواری کے لئے نہیں

دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں تنگ آچکی تھی اب وہ ایک "چرواہے" کے لئے مضطرب تھی۔ اور یسعیاہ نبی کے لفظوں میں خدا کا وہ فرستادہ چرواہا نمودار ہوگیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں زینوفن کے لفظوں میں "قوموں نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے استقبال کے لئے بے اختیار لپکیں" کیونکہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا، اور اگر رات کی تاریکی کے بعد صبح کی درخشنی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوت کی اس طولانی تاریکی کے بعد صبح سعادت کی اس جہاں تابی کا استقبال نہ کیا جاتا

اسرائیلی نبیوں کی شہادت

آج کل کے اصحاب انتقاد نظر یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے جب بھی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیوں کہ خود سائرس کے عہد میں جو اسرائیلی نبی موجود تھے، اُن کی شہادتیں موجود ہیں اور وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا۔ اور اسی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا۔ حزقیل اور دانیال سائرس کے معاصر تھے اور دارا کے زمانہ میں حجی اور ذکریاہ کے صحیفے مرتب ہوئے، اور زرکسیس (اردشیر یا ارتخشستت) کے عہد میں عذرا اور نحمیاہ کا ظہور ہوا۔ ان سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں، اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس نبی اسرائیل کی ایک موعود ہستی تھی اور خدا نے اسے برگزیدگی کے لئے چن لیا تھا۔

اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا، تو کیا ایک لمحہ کے لئے یہ بات تسلیم کی

تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل وکرم سمجھتا تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد وعمل تھا

لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟ یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور "مسیح" کہا اور وہ نبیوں کا موعود ومنتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان نہیں ہوسکتی۔ جس کا "داہنا ہاتھ خدا نے پکڑا ہو" اور جس کی "ٹیڑھی راہیں وہ درست کرتا جائے" یقیناً وہ خدا کا ناپسندیدہ بندہ نہیں ہوسکتا۔ خدا صرف انہی کا ہاتھ پکڑتا ہے جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں اور صرف اُن ہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے۔ جو اُس کے بھیجے ہوئے اور اس کی ٹھہرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بت پرست بادشاہ نے انہیں
نجات دلائی تھی۔ تو وہ اس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے مگر خدا
کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے اس کی نصبلیتیں مذہبی
ہوں۔ ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد کا توافق موجود
ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے
اعتراف کا تنہا واقعہ ہے اور ممکن نہیں کہ ایک ایسے انسان
کے لئے ہو، جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔
لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد
کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟
تاریخی حیثیت سے یہ قطعی ہے کہ سائرس زاردشت
کا پیرو تھا۔ جسے یونانیوں نے "زاردست رو" کے نام سے
پکارا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غالباً اسی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت
کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی
شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم مجوسی دین کی جگہ
نئے زردشتی دین کی بھی تخم ریزی کی تھی۔ وہ ایران میں نئی شہنشاہی
اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔
زردشت کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ
کا ایک مختلف فیہ موضوع بن گیا ہے، اور انیسویں صدی کا پورا زمانہ
مختلف نظریوں اور قیاسوں کی رد و کد میں بسر ہو چکا ہے بعضوں
نے اس کی تاریخی ہستی ہی سے انکار ہوا۔ بعضوں نے شاہنامہ

جا سکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرأت کرتے ؟ فرض کرو، یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں اور یہودیوں ہی میں پھیلیں، حتیٰ کہ ان کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں پھر کیا ممکن تھا کہ ایک بت پرست انسان کے لئے ایسی پیشین گوئیاں بنائی جا سکیں ؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک بت پرست کو اسرائیلی وحی کا ممدوح اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنا دیا تھا ؟

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اجنبیوں اور غیر اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا ان کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ ظہورِ اسلام کے وقت بھی یہی عصبیت انہیں اعترافِ حق سے روکتی تھی کہ " ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم" (۳: ۷۳) تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو ان کے لئے ہر اعتبار سے اجنبی تھا۔ اور نہ صرف اُس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا، بلکہ نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کر لیا۔ یہ صورت حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت ان کے لئے بڑی ہی عجیب شخصیت تھی۔ اور اس کی فضیلتیں الہی قطعی اور آشکارہ تھیں کہ ان کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کے لئے جو اجنبی بھی ہو، یہودیوں میں ایسی محبوبیت

نسل سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا اس لئے اس کا عم زاد بھائی دارا بن گشتاسپ تخت نشین ہو گیا۔ دارا نے بغاوت فرو کی گوماتہ کو قتل کیا اور نئی مملکت کو اس کے عروج و کمال تک پہنچایا۔ دارا کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۲۱ قبل مسیح میں ہوئی ہے پس اس کا عہد سائرس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہو گیا تھا

یونانی مؤرخوں کی شہادت موجود ہے کہ یہ بغاوت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیروؤں کی بغاوت تھی اور خود دارا اپنے کتبہ بے ستون میں "گوماتہ" کو "موگوش" لکھتا ہے یعنی مجوس اور مجوسی مذہب سے مقصود قدیم مذہب ہے [1]

تاریخ میں اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ پرانے مذہب کے پیروؤں کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ دوسری بغاوت "پرادرتیش"

---

[1] موگوش کا لفظ ایک جگہ اوستا میں آیا ہے، اور یہ بات اب قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ "موگوش" سے مقصود میڈیا کے اس مذہب کے پیرو ہیں۔ جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رائج تھا۔ چونکہ میڈیا کے باشندے بابل اور شام میں موگوش مشہور ہو گئے تھے اس لئے عربوں میں بھی یہی نام مشہور ہو گیا۔ اور موگوش نے مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر تمام ایرانیوں کو مجوس کہنے لگے۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ حالانکہ اصلاً مجوسی، زردشتیوں کے مخالف تھے

کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کر لیا۔ بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھا دی۔ اسی طرح محل کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین تاریخ گلڈنر کی۔ اسے پر متفق ہو گئے ہیں۔ ، اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زردشت کا زمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا اور گشتاسپ[۱] والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود وہی گشتاسپ ہے جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا زردشت کا ظہور شمالی مغربی ایران یعنی آذربائجان میں ہوا جسے اوستا کے عہد وندیداد میں ایریانہ ویجہ سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ کامیابی باختر میں ہوئی جس کا گورنر گشتاسپ تھا[۲] اس تحقیق کے مطابق زردشت کا سال وفات تقریباً ۵۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۸۰ قبل مسیح تک ہونا چاہیے اور سائرس کی تخت نشینی بالاتفاق ۵۵۰ ق م میں ہوئی۔ یعنی زردشت کی وفات کے بیس سال بعد یا عین اسی سال۔

---

[۱] گشتاسپ کو یونانیوں نے ہسٹاس پیز (Hystaspes) لکھا ہے

[۲] اے، وی۔ ڈیمس۔ جیکسن پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کی کتاب "انشینٹ پرشیا اینڈ ہز پرافٹ" (Ancient Persia & His Prophet) کا مطالعہ اس باب میں کفایت کرے گا۔

نامی مجوس نے کی تھی جسے دارا نے ہمدان میں قتل کیا، اور تیسری "چیترت تخمہ" نامی نے جو اربیل میں قتل ہوا۔

دوسرا واقعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے کہ دارا نے بعض کتبے پہاڑوں کی محکم چٹانوں پر نقش کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی برباد نہ کر سکا۔ ان میں سب سے اہم کتبہ بے ستون کا ہے جس میں دارا نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنی تخت نشینی کی سرگزشت قلمبند کی ہے دوسرا اصطخر کا ہے جس میں اپنے تمام ماتحت ممالک کے نام گنوائے ہیں ان دونو میں وہ بار بار "اہور مزدہ" کا نام لیتا ہے، اور اپنی تمام کامرانیوں کو اُس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے۔ کہ "اہورمزدہ" زردشت کی تعلیم کا "اللہ" ہے

اِن دو واقعوں پر ایک تیسرے واقعہ کا بھی اضافہ کر دینا چاہیئے یعنی تاریخ میں کوئی اشارہ اِس کا نہیں ملتا کہ کم بی سیز نے کوئی نیا دین قبول کیا تھا۔ یا دارا کو کوئی اِس طرح کا معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیروڈوٹس نے دارا کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے [1] اِس کے لئے دارا کے عہد کے واقعات بالکل قریبی زمانے کے واقعات تھے اور لیڈیا میں فارسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یونانیو

---

[1] دارا کی وفات بالاتفاق ۴۸۶ قبل مسیح میں ہوئی، اور ہیروڈوٹس ۴۸۴ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی دارا کی وفات سے صرف دو سال بعد۔

لیکن اگر سائرس زردوشت کا معاصر تھا، تو کیا کوئی براہ راست تاریخی شہادت موجود ہے جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ تمام قرائن جمع کیے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا کر دیئے ہیں تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے اور اس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا، بلکہ اس کا پہلا حکمراں داعی تھا، اور اس نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑا جو دو سو برس تک بلا اشتنا دین زرشتی پر عمل پیرا رہے

اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی جن واقعات پر پڑتی ہے وہ دو ہیں، اور دونوں کی تاریخی نوعیت مسلم ہے پہلا واقعہ "گوماتا" کی بغاوت کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی دوسرا دارا کے کتبے ہیں جن سے اس کے دینی عقائد کی نوعیت آشکارا ہو گئی ہے

سائرس کا بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال ہوا، اُس کے بعد اس کا بیٹا کم بی سیز (کمبوجیہ یا کیقباد تخت نشین ہوا۔ اس نے ۵۲۵ ق م میں مصر فتح کیا۔ لیکن ابھی مصر ہی میں تھا کہ معلوم ہوا، ایران میں بغاوت ہو گئی ہے اور ایک شخص "گوماتہ" نامی نے اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا لڑکا سمرڈیز (فارسی: بردیہ) مشہور کر دیا ہے جو بہت پہلے مر چکا تھا یا مار ڈالا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر وہ مصر سے لوٹا لیکن ابھی شام ہی میں تھا کہ ۵۲۲ قبل مسیح میں اچانک انتقال کر گیا۔ اب چونکہ سائرس کی براہ راست

جرأت نہیں کریں گے۔ اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا، اور سائرس کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور گمنامی میں بسر ہوا، تو کیا اسی زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جائیں؟ اور کیا ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ کہ اسی زمانہ میں سائرس زردشت کی تعلیم و صحبت سے بہرہ مند ہوا؟۔ سائرس کی ابتدائی زندگی کی سرگزشت تاریخ کی ایک گم شدہ داستان ہے پھر کیا اس داستان کا سراغ ہمیں ان دونوں شخصیتوں کی معاصرت کے واقعہ میں نہیں مل جاتا؟

مؤرخ زینوفن نے سائرس کی ابتدائی زندگی کا افسانہ ہمیں سنایا ہے اس افسانہ میں ایک پر اسرار شخص کی پرچھائیں صاف نظر آرہی ہے جو دشت و جبل کے اس پروردۂ قدرت کو آنے والے کارناموں کے لئے تیار کر رہا تھا۔ کیا اس پرچھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے؟ اگر زردشت کا ظہور شمالی مغربی ایران میں ہوا تھا اور اگر سائرس کی ابتدائی گمنامی کا زمانہ بھی شمالی کوہستانوں میں بسر ہوا، تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر ایک گم شدہ داستان کا سراغ نہ بن جائیں؟ سائرس کی شخصیت وقت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے اور صاف نظر آرہا ہے کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی

بہرحال سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو یا تخت نشینی کے بعد لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دین زردشتی

اور فارسیوں کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے: تاہم وہ کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پس سائرس کی وفات، اور دارا کی تخت نشین کے درمیان آٹھ برس کی جو مدت گذری ہے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِس عرصہ میں کسی نئی مذہبی دعوت کے ظہور و قبول کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔

اب غور کرو، ان واقعات کا لازمی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اگر سائرس کے بعد کم بی سیز اور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی، اور دارا دین زردشتی پر عامل تھا، تو کیا اس سے ثابت نہیں ہو رہا کہ دارا اور کم بی سیز سے پہلے زردشتی دین خاندان میں آچکا ہے؟ اگر سائرس کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیرو اس لئے بغاوت کرتے ہیں کہ کیوں ایک نیا مذہب قبول کر لیا گیا ہے، تو کیا یہ اِس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ سائرس نیا مذہب قبول کر چکا تھا، اور تبدیل مذہب کا معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائرس کا معاصر تھا، تو کیا یہ اس بات کا مزید ثبوت نہیں ہے کہ سب سے پہلے سائرس ہی نے یہ دعوت قبول کی تھی، اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا۔ اور نئی دعوت کا پہلا حکمران داعی بھی؟

زردشت اور سائرس

اتنا ہی نہیں، بلکہ ہم غور کرتے ہیں تو اس زنجیر کی کڑیاں اور آگے تک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی

آگ نے سورج کی قائم مقامی پیدا کر لی، کیونکہ تمام مادّی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سرچشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی، دونوں ظہور میں آتی تھیں، لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قوت پاک روحانی ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی، دوسری قوت برائی کے عفریتوں کی تھی۔ جو نوع انسانی کے جانی دشمن تھے۔ روحانی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوئی اور شیطانوں کی تاریکی میں نور و ظلمت کی یہی کشمکش ہے جس سے تمام اچھے برے حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحانیتوں کی نمود ہے۔ اس لئے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اسی کے لئے ہونی چاہییں۔ اس روشنی کا مظہر آسمان میں سورج اور زمین میں آگ تھی۔

اچھائی برائی کا جس قدر تصور تھا، وہ یونانیوں کی طرح صرف مادّی۔ زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحانی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔

آگ کی پرستش کی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں، اور اس کے خاص پجاریوں کا ایک مقدس گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے افراد "موگوش" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اسی لقب نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا۔

لیکن زردشت نے ان تمام عقائد سے انکار کر دیا، اُس نے خدا پرستی روحانی سعادت و شقاوت، اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ پیدا کیا اُس نے

شامل ہیں۔

دین زردشتی کی حقیقی تعلیم

لیکن اگر ذوالقرنین دین زردشتی پر عمل تھا، اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسے ملہم من اللہ قرار دیتا ہے، تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں کیونکہ یہ حقیقت اب پوری طرح روشنی میں آ چکی ہے کہ زردشت کی تعلیم سرتاسر خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تھی، اور آتش پرستی اور ثنویت کا اعتقاد اس کا پیدا کیا ہوا اعتقاد نہیں ہے، بلکہ قدیم میدوی مجوسیت کا ردِ عمل ہے۔

جس طرح روم کی مسیحیت قدیم رومی بت پرستی کے ردِ عمل سے محفوظ نہ رہ سکی، اسی طرح زردشت کی خالص خدا پرستار تعلیم بھی قدیم مجوسیت کے ردِ عمل سے بچ نہ سکی، خصوصاً ساسانی عہد میں جب وہ از سرِ نو مدون ہوئی تو اصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز بن چکی تھی۔

زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اور میڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جو انڈو یورپین آریاؤں کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریوں کی طرح ایران کے آریوں میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی۔ پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا ——————— پھر زمین میں

عبادت ہمیں اس لئے نہیں کرنی چاہیئے کہ خدا کے غضب وانتقام سے بچیں، بلکہ اس لئے کہ برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں۔ اگر ہم اہورمزدہ کی عبادت نہیں کریں گے تو وہ ہمیں یونانی اور ہندوستانی دیوتاؤں کی طرح اپنے غضب کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ لیکن خود ہم سعادت سے محروم رہ جائیں گے

اس کی تعلیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو آخرت کی زندگی کا اعتقاد ہے وہ کہتا ہے: انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی اس دنیا میں گذرتی ہے اس کے بعد بھی ایک زندگی پیش آئے گی اس زندگی میں دو عالم ہوں گے ایک اچھائی اور سعادت کا۔ دوسرا برائی اور شقاوت کا جن لوگوں نے اس زندگی میں نیک عمل کئے ہیں، وہ پہلے عالم میں جائیں گے جنہوں نے برے عمل کئے ہیں دوسرے عالم میں۔ اور اس کا فیصلہ اس دن ہوگا جسے وہ "آخری فیصلہ" کا دن قرار دیتا ہے

بقائے روح کا مسئلہ اس کے مذہب کی بنیادی چٹان ہے۔ انسان فانی ہے مگر اس کی روح فانی نہیں۔ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اور ثواب وعقاب کے دو عالموں میں سے کسی عالم میں داخل ہو جاتی ہے

موجودہ عہد کے تمام محققین تاریخ متفق ہیں کہ زردشت کی تعلیم نے انسان کے اخلاقی اور فکری ارتقاء میں نہایت موثر حصہ لیا ہے اس نے پانچ سو برس قبل مسیح ایرانیوں کو اخلاقی پاکیزگی کی ایک ایسی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ جہاں سے اُن کے معاصر یونانیوں اور رومیوں کی زندگی بہت ہی

کہا: یہاں نہ تو خیر کی بہت سی روحانی ہستیاں ہیں، نہ شر کے بہت سے عفریت۔ یہاں صرف ایک "اہورمزدہ" کی ہستی ہے جو نگاہ نہے، نور ہے، قدوس ہے، احق ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، اور تمام کائنات ہستی کی خالق ہے۔ کوئی ہستی نہیں جو اس کے مثل ہو، یا اس کے ہمتا ہو یا اس کی شریک ہو۔ تم نے جن روحانی قوتوں کو خیر کا خالق سمجھ رکھا ہے، وہ خالق و فاد نہیں ہیں بلکہ "اہورموزدہ" کے پیدا کئے ہوئے "امش اسپند" ہیں یعنی ملائکہ ہیں۔ اور شر کا ذریعہ دیوتوں کی خوفناک قوت نہیں ہے، بلکہ "انگرہ مینو" (اہرمن) کی ہستی ہے۔ یعنی شیطان کی ہستی ہے یہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے انسان کو تاریکی کی طرف لے جاتی ہے

زردشت کی تعلیم کا عملی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔ یونانیوں کی طرح اس کا اخلاقی تصور مذہب سے الگ نہیں تھا بلکہ عین مذہب میں تھا اس نے مذہب کو محض ایک قومی اور ملکی مذہب کی شان نہیں دی بلکہ انفرادی زندگی کا روزانہ دستور العمل بنا دیا۔ نفس کی طہارت اور اعمال کی درستگی اس کی تعلیم کا اصلی محور ہے انسانی زندگی کا ہر خیال، ہر قول ہر فعل ضروری ہے کہ اس معیار پر پورا اترے فکر کی راستی، گفتار کی راستی اور کردار کی راستی "پرستاران اہورمزدہ" کے لیے تین اصول بنیادی تھے۔ پروفیسر گرنڈی کے لفظوں میں اُس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا یونانی مذہب کی طرح محض رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا۔ اس نے مذہب کو ایرانیوں کی ایک حقیقت بنا دیا۔ اور اخلاق اس مذہب کا مرکزی عنصر تھا اس کی عبادت کا تصور ہر طرح کے اصنامی اثرات سے پاک تھا

دارا کے فرامین

دارائے اوّل کا زمانہ اس مذہب کی بلند آہنگی کا شاندار زمانہ ہے
اس کے کتبوں میں ہمیں زردشتی تعلیم کی صدائیں صاف سنائی دے رہی ہیں اور ان سے ہم حقیقت حال معلوم کر سکتے ہیں۔ استخر کا کتبہ ڈھائی ہزار برس بیشتر کی یہ منادی آج تک بلند کر رہا ہے:

خدائے بزرگ و برتر اہورمزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی، اسی نے آسمان بنایا، اسی نے انسان کی سعادت بنائی، اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا"

دارا اعلان کرتا ہے کہ:

" اہورمزدہ نے اپنے فضل سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن وامان قائم کیا۔ میں اہورمزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے، میرے خاندان کو، اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اے اہورمزدہ! میری دعا قبول کر!"

اے انسان! اہورمزدہ کا تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ صراط مستقیم کو نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ

یاد رہے کہ دارا سائرس کا معاصر تھا، اور اس کی وفات سے صرف آٹھ برس بعد تخت نشین ہوا۔ پس دارا کی صدائیں

پست دکھائی دیتی ہے ایک ایسا مذہب جس کی تعلیم کا رُخ سر تا سر انفرادی زندگی کی پاکیزگی کی طرف تھا اور جو اپنے پیروؤں کی اخلاقی روش کے لئے نہایت بلند مطالبے رکھتا تھا، ضروری تھا کہ اعمال و خصائل کے بہتر سانچے ڈھال دے اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ اس نے ڈھال دیئے تھے یہ شہادت کن لوگوں کے قلم سے نکلی ہے؟ ان لوگوں کے قلم سے جو کسی طرح بھی ایرانیوں کے دوست نہیں سمجھے جا سکتے پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا تمام زمانہ ایرانیوں اور یونانیوں کی مسلسل آویزش کا زمانہ رہا ہے، اور ہیروڈوٹس اور زینوفن نے جب تاریخیں لکھی ہیں، تو یونانیوں کے حریفانہ جذبات پوری طرح ابھرے ہوئے تھے تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کی اخلاقی فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے انہیں ماننا پڑتا ہے کہ ان میں بعض ایسی عظیم فضیلتیں رکھتے تھے جو یونانیوں میں نہیں پائی جاتیں،

یہاں پروفیسر گرنڈی کے الفاظ پھر مستعار کر لیں گے کہ

"ایرانی سچائی اور دیانت کی ایسی فضیلتیں رکھتے تھے جو اُس عہد کی قوموں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتی"

ان کی راست بازی، رحم دلی، شجاعت اور بلند نظری کا سب اعتراف کرتے ہیں، اور یہ یقیناً زردشت کی تعلیم کے لازمی نتائج تھے

طرح طرح کی تبدیلیوں، تحریفوں اور اضافوں سے یک قلم منسوخ ہو چکی نہیں چنانچہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ ساسانی عہد کا مذہب قدیم مجوسیت زردشتیت اور یونانیت کا ایک مخلوط مرکب ہے۔ اور اس کا بیرونی رنگ و روغن تو تمام تر مجوسیت ہی نے فراہم کیا ہے اسی ساسانی اوستا کا ایک ناقص اور محرّف ٹکڑا ہے جو ہندوستان کے پارسیوں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے اور جس کے لئے ہم ایک فرنچ مستشرق آنک تیل کی اولوالعزمیوں اور علمی قربانیوں کے شکرگذار ہیں۔

اہورمزدہ کی مزعومہ شبیہ

اس سلسلے میں ایک بحث طلب سوال اور بھی ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ یہ مسلّم ہے کہ پیروان زردشت میں بت پرستی کی کبھی کوئی شکل سر نہ اٹھا سکی۔ قدیم مجوسی مذہب میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن ایران میں دارا اور اس کے بعد کے عہد کے جو آثار ملے ہیں، ان میں ایک خاص صورت کا نقش پایا جاتا ہے۔ یہ بادشاہ کی تصویر نہیں ہو سکتی کیوں کہ بادشاہ کی شخصیت مرقع میں الگ نمایاں ہے۔ اس کا محل ہر جگہ بلندی میں اور سب سے اوپر واقع ہوا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ خود بادشاہ سے بھی ایک بلند تر ہستی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کون ہستی ہے؟ سب سے پہلے یہ صورت بے ستون کے مرقع میں زیر بحث ہوئی

میں ہم خود سائرس کی صدائیں سن رہے ہیں۔ اس کا بار بار اپنی کامرانیوں کو اہورمزدہ کے فضل و کرم سے منسوب کرنا ٹھیک ٹھیک ذوالقرنین کے اس طویل خطاب کی تصدیق ہے کہ ہذا رحمۃ من ربی (۹۸)

لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد زردشتی مذہب کا تنزل شروع ہو گیا۔ ایک طرف قدیم مجوسی مذہب نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا دوسری طرف خارجی اثرات بھی کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انٹاینین (Antonine) شہنشاہ روم کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائرس اور دارا کے عہد کے زردشتی مذہب نے بالکل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر سکندر اعظم کی فتوحات کا سیلاب اٹھا اور وہ ایران کی دو صد سالہ شہنشاہی ہی نہیں بلکہ اس کا مذہب بھی بہا لے گیا۔ ایرانیوں کا قومی افسانہ کہتا ہے کہ زردشت کا مقدس صحیفہ اوستا بارہ ہزار بیلوں کی مدبوغ کھالوں پر آب زر سے لکھا ہوا تھا جو سکندر کے حملہ استخر میں جل کر راکھ ہو گیا۔ بارہ ہزار بیلوں کی کھال کا قصہ تو محض مبالغہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس نے جو سلوک تورات کے ساتھ کیا تھا، وہی سکندر کے حملہ ایران نے اوستا کے ساتھ کیا۔ یعنی دونوں جگہ مذہب کا اصلی نوشتہ مفقود ہو گیا۔

پھر جب پانچ سو پچاس برس کے بعد ساسانی دور حکومت شروع ہوا تو مذہب زردشت کی ازسر نو تدوین کی گئی، اور جس طرح قید بابل کے بعد عزرا نے نئی تورات مرتب کی تھی۔ اسی طرح اردشیر بابکانی نے ازسر نو اوستا کا نسخہ مرتب کرایا، لیکن اب مذہب کی تمام حقیقی خصوصیات

چلا ہے اور تمام تاریخی اور عقلی قرائن اس کے خلاف ہیں

اولاً تمام تاریخی شہادتیں اور خود پارسیوں کا مسلسل تعامل ثابت کر رہا ہے کہ انہوں نے الوہیت کا تصور کبھی کسی انسانی جسم و صورت میں نہیں کیا، اور کبھی کسی مجسمہ کو تقدیس کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ثانیاً اگر امتداد زمانہ سے یہ چیز پیدا بھی ہو گئی ہو، جب بھی کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ خود دارا کے عہد میں پیدا ہو گئی ہو، جو زردشت کی تعلیم کا ابتدائی عہد تھا اور جب یونانی مؤرخوں کی شہادت کے مطابق، ایرانی یونانی بُت پرستی کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

ثالثاً اس شبیہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو معبودیت و الوہیت کی کوئی خاص شان رکھتی ہو۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی صورت اور وضع ہے اور وہ ایک معمولی انسان کی ہے جس نے اس زمانے کا عام لباس پہن رکھا ہے۔ وہی لباس جو خود دارا اور اس کے جانشینوں کا تصویروں میں دکھایا گیا ہے۔ صرف اتنی بات اس میں زیادہ ہے کہ ایک حلقہ

پچھلے صفحے کے حاشیہ کا بقایا) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر اس نقاش کی ہے جس نے مرقع نقش کیا تھا اور جو حلقہ اس کی کمر کے گرد نظر آرہا ہے۔ یہ معماروں کی ٹوکری ہے جس میں بیٹھ کر بلندی پر کام کیا کرتے تھے۔ (دیکھو مصنف مذکور کی کتاب (One Primeval Language) جلد سوم صفحہ نمبر ۱۱۷

جب ۱۸۴۷ء میں کرنیل رالین سن نے اپنی شرح و حل کے ساتھ اصل مرقع کا چربہ شائع کیا۔ پھر یہی صورت متعدد نقوش میں ملی مثلاً دارا کی سرکاری مہر کے مرقع میں، نقش رستم میں جو دراصل دارا کی قبر ہے استخر کے محلِ شاہی کے دروازہ پر جو غالباً درمیانی دروازہ ہے

رالین سن سے پہلے سر رابرٹ کیر پورٹر نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ یہ کوئی مافوق الانسانیت ہستی ہونی چاہیے جو خود بادشاہ سے بھی اوپر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ رالین سن ایک قدم اور آگے بڑھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ اہورمزدہ کی ہستی ہے، یعنی خدا کی۔ چنانچہ اس وقت سے یہ رائے برابر مقبول ہوتی گئی اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایرانی اگرچہ بت پرستی سے مجتنب رہے، لیکن انہوں نے اہورمزدہ کی ہستی کے لئے ایک مرموز (یعنی Symbolic) تشخص کا تصور ضرور قائم کر لیا تھا جو ان تصویروں میں نمایاں ہے اور یہ مصریوں اور آشوریوں کے مرموز تجسّم کا اثر تھا جس سے وہ بھی متاثر ہو گئے۔ ۵۸

لیکن ۱۹۱۲ عیسوی سے (جب کہ میں نے پہلے پہل ایرانی آثار قدیمہ کا بغور مطالعہ کیا) میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ قیاس اول دن سے غلط رخ پر

---

۵۸ عام رائے یہی ہو گئی ہے، لیکن ایسی صدائیں برابر اٹھتی رہی ہیں جنہیں اس رائے سے اختلاف ہوا۔ کرنیل رالین سن کی اشاعات کے چند سال بعد لغاتِ شرقیہ کے ایک عالم ریورنڈ چارلس نارسٹر (Forster) باقی اگلے صفحہ پر

ہوتی ہے کہ سائرس کی تصویر ہو۔[۱]

---

[۱] ۱۹۱۳ء میں میں نے اپنا یہ خیال مسٹر اڈورڈ براؤن۔ پروفیسر کیمرج یونیورسٹی و مصنف لٹریری ہسٹری آف پرشیا وغیرہ

(Mr. Edward Brown. Professor Cam—bridge University & Author Liter—ary History of Persia)

کو لکھا تھا انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا۔ اور بہت اصرار کے ساتھ لکھا تھا کہ بعض مستشرقین جرمنی سے اس بارے میں مراسلت کروں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے لکھا، وہ خود اس بارے میں خط و کتابت کر رہے ہیں لیکن اس کے بعد جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور میری خط و کتابت کا سلسلہ سنسر کی سخت گیریوں نے بالکل معلوم کر دیا اور پھر نظر بند ہو گیا، اور جب چھوٹا تو اس کے چند دنوں بعد اُن کے انتقال کی خبر آ گئی۔

اُس کی کمر سے نیچے چاروں طرف بنا دیا گیا ہے، اور عقب میں ایک ایسا طولانی نقش ہے جس میں لہروں کی سی شان پیدا ہو گئی ہے اس حلقہ اور لہروں کو سورج کی مرموز شکل قرار دیا گیا ہے اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی یہ اس کے لئے کافی نہیں کہ محض یہ شبیہ حلقہ اور شبیہ لہریں ایک خالق ہستی کے تصور کے لئے پیروانِ زردشت کا منتہائے خیال تھا

دالعاً اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو اس حلقہ اور لہروں میں ایک مادرائے انسانیت ہستی کا تصور مرموز تھا جب بھی یہ اہور مزدہ کی ہستی کیوں ہو، جس کی نسبت زردشت نے تقدیس و علو کا اس درجہ بلند تصور قائم کیا ہے، کیوں یہ کسی ایسے انسان کی صورت نہ ہو جو اگرچہ انسان تھا مگر اپنی انسانیت کی رفعت و تقدیس کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہستی سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً خدا کی ایک فرستادہ ہستی۔

بہر حال اس رخ پر ہم جس قدر بڑھتے ہیں، یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ اسے اہور مزدہ کی ہستی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے یہ یا تو خود زردشت کی تصویر ہے جو ایرانی مذہب کا بانی تھا، یا سائرس کی ہے جو اس مذہب کا حکمراں پیغمبر اور ہخامنشی شہنشاہی کا پہلا تاجدار تھا۔

چونکہ اس صورت کے ہاتھ میں ہر جگہ ایک حلقہ دکھایا گیا ہے اور قدیم تصورات میں حلقہ کی شکل حکومت و مالکیت کی علامت سمجھی جاتی تھی اس لئے زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم

باقی رہی یہ بات کہ یہ وحی نبوت کی وحی تھی یا اُس طرح کی وحی تھی جیسی حضرت موسیٰ کی والدہ کی نسبت بیان کی گئی ہے کہ " واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ " (۲۸ : ۷) تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین بنی تھا اور متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد حافظ ابن کثیر بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

اور غور کرو، قرآن کا یہ بیان سائرس کی شخصیت پر کس طرح ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہا ہے؟ تاریخ اس کی پیغمبرانہ شخصیت کی شہادت دے رہی ہے، اور عہد عتیق کے انبیاء اسے صریح خدا کا برگزیدہ، اس کا مسیح اور اس کی مرضی پوری کرنے والا کہہ رہے ہیں۔ عزرا کی کتاب میں اس کا جو فرمان تعمیر بیت المقدس کے لئے نقل کیا گیا ہے، اس میں وہ خود اعلان کرتا ہے: " خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہودیا کے ملک میں اس کی عبادت کے لئے ایک ہیکل تعمیر کر دوں" اس کا یہ کہنا ہے کہ: " خدا نے مجھے حکم دیا ہے " ٹھیک ٹھیک قلنا یا ذاالقرنین کی تصدیق ہے۔ ہم اس سے پہلے اس کی خدا پرستی کے اثبات میں جو کچھ لکھ چکے ہیں اس میں سے ہر بات ٹھیک ٹھیک اس کی نبوت کے ثبوت میں بھی کہی جا سکتی ہے

اب صرف ایک معاملہ کی تشریح باقی رہ گئی ہے یعنی یاجوج ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟ اور جو سد سائرس نے بنائی تھی اس کی تاریخی نوعیت کیا ہے؟

کیا ذوالقرنین نبی تھا؟

جہاں تک قرآن کی تصریحات کا تعلق ہے ایک اہم سوال اور باقی رہ گیا ہے۔ قرآن میں ہے: "قلنا یاذا القرنین" ہم نے کہا اے ذوالقرنین اس خطاب کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین براہِ راست وحیِ الٰہی سے مخاطب تھا؟ مفسرین نے اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں، اور چونکہ امام رازی سکندر مقدونی کو ذوالقرنین بنانا چاہتے ہیں اور وہ بنتا نہیں، اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں قلنا کے منطوق پر اس کے مفہوم کو ترجیح دیں

اس میں شک نہیں کہ قلنا کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بالواسطہ خطاب ہو۔ یعنی اس عہد کے کسی پیغمبر کے ذریعہ ذوالقرنین کو مخاطب کیا گیا ہو جیسا کہ "فقلنا اضربوه ببعضها" (۲: ۷۳) میں ہے۔ یا خطاب قولی نہ ہو، تکوینی ہو۔ جیسا کہ "وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی" (۱۱: ۴۴) اور "قلنا یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ ابراہیم" (۲۱: ۶۹) وغیرہا آیات میں ہے لیکن اس طرح کا مطلب جب ہی قرار دینا چاہیئے کہ اس کے لئے قوی وجوہ موجود ہوں، اور یہاں کوئی وجہ موجود نہیں۔ آیت کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ ذوالقرنین کو اللہ نے براہِ راست مخاطب کیا، اور اس پر اللہ کی وحی نازل ہوئی تھی۔

بنسیاں ماروں گا۔ تیرے سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں کو جو جنگی پوشاک پہنے چوپہریاں اور سپر لئے ہوئے ہیں اور سب شمشیر بکف ہیں کھینچ نکالوں گا۔ اور میں ان کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط کو بھی کھینچ نکالوں گا جو سپر لئے ہوئے اور خود پہنے ہوں گے۔ نیز جومر اور شمالی بعید کے اطراف کے باشندگان تجرمہ اور ان کا سارا لشکر۔"

اس کے بعد دور تک تفصیلات چلی گئی ہیں۔ اور چار باتیں خصوصیت کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جوج شمال کی طرف سے آئے گا، تاکہ لوٹ مار کرسکے۔ دوسری یہ کہ " ماجوج پر اور اُن پر جو جزیروں میں سکونت رکھتے ہیں تباہی آئے گی" تیسری یہ کہ جو لوگ اسرائیل کے شہروں میں بسنے والے ہیں، وہ بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے اور اُن کے بے شمار ہتھیار ان کے ہاتھ آئیں گے۔ چوتھی یہ کہ ماجوج کی تباہی کا گورستان "مسافروں کی وادی" میں بنے گا جو "سمندر کے پورب میں ہے" اُن کی لاشیں عرصہ تک وہاں پڑی رہیں گی۔ لوگ انہیں گاڑتے رہیں گے تاکہ رہگذر صاف ہو جائے

(باب ۳۸-۳۹)

یہ واضح ہے کہ اس پیشین گوئی سے پہلے سائرس کے ظہور اور یہودیوں کی آزادی و خوش حالی کی پیشین گوئی بیان کی جا چکی ہے۔ اور یہ پیشین گوئی عمل ٹھیک اس مکاشفہ کے بعد ہے جس میں حزقیل نبی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا، اور جسے قرآن نے بھی سورہ بقر کی آیت " او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا" (۲: ۲۵۹) میں بیان کیا ہے

یاجوج ماجوج

قرآن مجید نے یاجوج اور ماجوج کا دو جگہ ذکر کیا ہے ایک تو یہاں ہے، دوسرا سورہ انبیاء میں ہے: "حتیٰ اذا فتحت یاجوج و ماجوج وہم کل حدب ینسلون" (۲۱: ۹۶)

یاجوج اور ماجوج کا نام سب سے پہلے عہد عتیق میں آیا ہے حزقیئل نبی کی کتاب میں جنہیں بخت نصر اپنے آخری حملہ بیت المقدس میں گرفتار کر کے بابل لے گیا تھا اور جو سائرس کے ظہور تک زندہ رہے یہ پیشین گوئی ملتی ہے :

"اور خداوند کا کلام مجھ تک پہنچا۔ اس نے کہا اے آدم زاد تو جوج کی طرف اپنا منہ کر کے اس کے برخلاف نبوت کر جوج کی طرف۔ جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روس مسک اور توبال کا سردار ہے۔ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ میں تیرا مخالف ہوں۔ میں، تجھے پھرا دوں گا۔ تیرے جبڑوں میں

سکتا تھا یا خود یونانی میں پہلے سے یہ نام موجود تھے؟ اس بارے میں شارحین کی رائیں مختلف ہیں لیکن زیادہ قرینہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں نام اسی طرح یا اس کے قریب قریب یونانیوں میں بھی مشہور تھے

اب سوال یہ ہے کہ یہ کون قوم تھی؟ تمام تاریخی قرائن متفق طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی مگر طاقتور قبائل جن کا سیلاب قبل از تاریخ عہد سے لے کر نویں صدی مسیحی تک برابر مغرب کی طرف امنڈتا رہا، جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کے لئے چینیوں کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی تھی جن کی مختلف شاخیں تاریخ میں مختلف ناموں سے پکاری گئی ہیں اور جن کا آخری قبیلہ یورپ میں میگر کے نام سے روشناس ہوا، اور ایشیا میں تاتاریوں کے نام سے۔ اسی قوم کی ایک شاخ تھی جسے یونانیوں نے سیتھین (Scythian) کے نام سے پکارا ہے، اور اسی کے حملوں کی روک تھام کے لئے سائرس نے سد تعمیر کی تھی

منگولیا

شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب "منگولیا" کہلاتا ہے۔ لیکن "منگول" لفظ کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے لئے جب ہم چین کے تاریخی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں (اور ہمیں اسی طرف رجوع ہونا چاہیئے کیونکہ وہ منگولیا کے ہمسایہ میں ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم

پس ضروری ہے کہ جوج اور ماجوج کا معاملہ بھی اسی زمانہ کے لگ بھگ پیش آنے والا ہو۔ یعنی سائرس کے زمانہ میں اور یہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا ایک مزید ثبوت ہے کیونکہ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ اسی نے یاجوج وماجوج کے حملوں کی روک تھام کے لئے ایک سد تعمیر کی تھی۔

عہدِ عتیق کے بعد یہ نام ہمیں مکاشفات یوحنا میں بھی ملتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا، اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج وماجوج کو گمراہ کرنے اور لڑائی کے لیے جمع کرنے نکلے گا۔ ان کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا۔ وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائیں گی۔" (۲۰، ۷)

گاگ اور میگاگ

یاجوج اور ماجوج کے لئے یورپ کی زبانوں میں Gog اور (Magog) کے نام مشہور ہیں، اور شارحین تورات کہتے ہیں کہ یہ نام سب سے پہلے تورات کے ترجمہ سبعینی[1] میں اختیار کئے گئے تھے لیکن کیا اس لئے اختیار کئے گئے تھے کہ جوج اور ماجوج کا یونانی تلفظ یہی ہو

---

[1] ترجمہ سبعینی سے مقصود تورات کا وہ پہلا یونانی ترجمہ ہے جو اسکندریہ میں شاہی حکم سے ہوا تھا اور جس میں ستر علماء یہود شریک تھے۔

بس کر وہاں کی خصوصیات اختیار کر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ ایک مقامی قوم بن جاتے تھے، لیکن ان کا وطنی سرچشمہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا یہاں تک کہ پھر قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا اور کسی نئے علاقے میں پہنچ کر نئی مقامی قومیت کی تخلیق کر دیتا۔

یہ علاقہ صدیوں تک اپنی اصلی وحشیانہ حالت پر باقی رہا۔ لیکن جو قبائل یہاں سے نکل نکل کر مختلف ملکوں میں بستے گئے۔ انہوں نے مقامی خصوصیت اختیار کر کے تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنا شروع کر دیا یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد ان کی حالت اس درجہ مختلف ہو گئی کہ ان میں اور ان کے قدیم ہم وطنوں میں کوئی بات بھی مشترک باقی نہیں رہی۔ وہ اب مہذب ہو رہے تھے۔ یہ بدستور وحشی تھے۔ وہ تہذیب کے صناعی ہتھیاروں سے لڑتے تھے، یہ وحشت کی قدرتی بہیمیت اور درندگی سے۔ ان میں زراعت، صناعت اور ذہنی ترقی کی مختلف مشاغل ابھر رہی تھیں وہ ان سب سے ناآشنا تھے سرد علاقہ کی صحرائی زندگی اور وحشیانہ خصائل کی خشونت نے انہیں وقت کی شائستہ اقوام کے لیے ایک خوفناک ہستی بنا دیا تھا۔

قبل اس کے کہ تاریخی عہد کی صبح طلوع ہو شمالی مغربی قبائل کی یہ مہاجرت شروع ہو چکی تھی اور اس کا سلسلہ تاریخی عہد میں بھی بدستور جاری رہا۔

ان ہی قبائل کا ایک ابتدائی گروہ وہ تھا جو آرین نسل کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ وسط ایشیا سے یورپ کی طرف بڑھا

نام "موگ" تھا۔ یقیناً یہی "موگ" ہے جو چھ سو برس قبل مسیح یونانیوں میں "میگ" اور "گاگ" پکارا جاتا ہوگا اور یہی عبرانی میں "ماجوج" ہو گیا۔

چین کی تاریخ میں ہمیں اس علاقہ کے ایک اور قبیلہ کا ذکر بھی ملتا ہے جو "یواچی" (Yueh-Chih) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی "یواچی" ہے جس نے مختلف قوموں کے مخارج و تلفظ سے گزر کر کوئی ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ عبرانی میں "یاجوج" ہو گیا۔

اس امر کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ان نتائج پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو مختلف قوموں کے نسلی، جغرافیائی اور لغوی علائق کی بحث و تنقیب سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جو موجودہ زمانے میں تاریخ اقوام کے طے شدہ مبادیات ہیں۔

کرۂ ارضی کی بلند سطح کا وہ حصہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور جسے آج کل منگولیا اور چینی ترکستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تاریخ قدیم کی بیشمار قوموں کا ابتدائی گہوارہ رہ چکا ہے۔ یہ نسل انسانی کا ایک ایسا سرچشمہ تھا جہاں پانی برابر ابلتا اور جمع ہوتا رہتا، اور اور جب بہت بڑھ جاتا تو مشرق و مغرب کی طرف امنڈنا چاہتا۔ اس کے مشرق میں چین تھا، مغرب و شمال میں یورپ۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے قوموں اور قبیلوں کے سیلاب امنڈتے رہے۔ کچھ وسط ایشیا میں آباد ہو گئے کچھ آگے بڑھے اور شمالی یورپ تک پہنچ گئے۔ کچھ وسط ایشیا سے نیچے اتر گئے اور جنوبی و مغربی ایشیا پر قابض ہو گئے۔ یہ قبائل جو اس علاقے سے نکلے تھے، مختلف ملکوں میں

موزوں تھا۔ اس لئے بہت جلد انہوں نے زراعتی زندگی اختیار کر لی، اور پھر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگیں۔ لیکن جو شاخیں یورپ کی طرف بڑھیں انہیں ایسا ماحول میسر نہیں آیا۔ اس لئے صحرائی زندگی کی تمام خصوصیات ان میں بدستور باقی رہیں اور صدیوں تک متغیر نہ ہوئیں۔ اب گویا ان قبائل کی تین حالیتں ہو گئی تھیں

اولاً منگولیا کے اصلی باشندے جو یک قلم جنگی اور صحرائی تھے اور ان کی یہ حالت بغیر کسی تغیر کے برابر قائم رہی

ثانیاً، بحر اسود کے شمالی ساحل اور شمالی یورپ کے قبائل، جو گو اپنے مولد اصلی سے الگ ہو گئے تھے، لیکن ان کی وحشیانہ خصوصیات نہیں بدلی تھیں۔

ثالثاً ہندوستان، ایران اور اناتولیا کے قبل جو تدریج تہذیب و حضارت میں ترقی کرنے لگے، اور پھر آگے چل کر بڑی قدیم تہذیبوں کے بانی ہوئے

یاجوج ماجوج کا اطلاق

تقریباً... قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی مسیحی تک یاجوج اور ماجوج یا گوگ اور میگگ کا اطلاق پہلی دو قسموں پر ہوتا رہا پہلی پر اس لئے کہ قومیت اور مقام کے لحاظ سے وہی یاجوج ماجوج تھی دوسری پر اس لئے کہ گو اپنے مولد و مقام سے الگ ہو چکی تھی لیکن اپنی انہیں وحشیانہ خصوصیات میں بالکل متغیر نہیں ہوئی تھی۔ تیسری قسم چونکہ یک قلم منقلب

ایک نیچے اتر کر پنجاب میں آباد ہو گیا۔ ایک مغرب کی طرف بڑھا اور فارس اور میڈیا میں اور اناتولیا میں بس گیا۔ اسے اب انڈو یوریین آریا کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ ہندوستان اور یورپ دونوں کی آریائی اقوام کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کا جو حصہ شمالی ہند میں بس گیا تھا اُس نے اپنا نسلی خطاب برابر یاد رکھا اور اپنے آپ کو آریا در کہتا رہا۔ جو فارس اور میڈیا میں بسا اُس نے اپنی ابتدائی قیام گاہ کو ایریانہ کے نام سے موسوم کیا (جسے اوستا میں ایر یانہ دیگو کہا گیا ہے) اور یہی ایریانہ ایران ہو گیا۔ جو قبائل اناتولیا تک پہنچ گئے تھے۔ وہ (غالباً ہٹی (Hittite) کے نام سے پکارے گئے، جنہیں توریت کی کتاب پیدائش میں "حتی" کہا گیا ہے، اور مصر کے قدیم نوشتوں میں "ختی" پایا جاتا ہے۔

جو قبائل یورپ میں پہنچے، وہ گوتھ، فرانک، الامان، ونڈال، ٹیوٹان اور رہین کے نام سے مشہور ہوتے، اور ان ہی کی ایک وسیع شاخ وہ تھی جو بحر اسود سے لے کر دریائے ڈینوب کی بالائی وادی تک پھیل گئی اور سیتھیَن کے نام سے پکاری گئی۔ وسط ایشیا کے مشرقی قبائل بھی جو بکڑیا (بلخ) پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔ سیتھیین ہی تسلیم کئے گئے ہیں اور خود دارا نے اپنے کتبہ استخر میں انہیں اسی نام سے پکارا ہے

ان قبائل کی جو تین شاخیں۔ شمالی ہند، اناتولیا د ایشیائے کوچک) اور ایران میں بس گئی تھیں، انہیں ایسا ماحول ملا جو زراعت کے لئے

دودھ اور شکار کے گوشت پر اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ اقامت گزین قبائل کو اناج پر۔ وہ گھوڑوں کی برہنہ پیٹھ پر زندگی بسر کرتے۔ یہ کھیتوں میں اور مکانوں کی چار دیواری میں ان کی زندگی کا ماحول صحرائیت تھی۔ ان کا ماحول شہرت ان کو نشوونما کے لئے جنگ کی ضرورت تھی، ان کو امن کی۔ ان کا جسم روز بروز طاقتور اور محنت پسند ہوتا جاتا تھا، ان کا روز بروز کمزور اور راحت پسند۔ وہ روز بروز وحشت وخونخواری میں بڑھتے جاتے تھے، یہ روز بروز تہذیب وحضارت میں، تہذیب وحضارت کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات وخصائل میں لطافت اور نرمی پیدا ہو۔ صحرائیت وخانہ بدوشی کا لازمی نتیجہ تھا کہ جذبات تند اور خصائل میں وحشت وخشونت ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ جوں جوں اقامت گزین قبائل شائستہ ہوتے جاتے، صحرانورد قبائل کی ہستی اُن کے لیے ہولناک اور ناقابلِ مزاحمت ہوتی جاتی جب کبھی دونوں میں مقابلہ ہوتا تو شہری قبائل دیکھتے کہ صحرانورد قبائل عفریتوں کی طرح خوفناک اور درندوں کی طرح خونخوار ہیں۔ اور صحرانورد قبائل معلوم کر لیتے کہ ان کی غارت گریوں کے لئے شہری آبادیوں سے زیادہ کوئی سہل شکار نہیں

البتہ صحرانورد قبائل متفرق تھے، اور اقامت گزینی کے طریقوں سے ناآشنا۔ اقامت گزین قبائل باہم مربوط تھے اور معیشت کے منظم طریقوں سے آشنا، اس لئے قدرتی طور پر صحرانوردوں کے حملے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ وہ خوفناک درندوں کی طرح آبادیوں پر گرتے اور قتل وغارت کر کے نکل جاتے لیکن جم کر ٹک نہیں سکتے تھے، اور نہ علاقے فتح کر کے اپنے قبضہ میں رکھ سکتے تھے۔ مگر

ہو چکی تھی، اس لئے اب وہ یاجوج و ماجوج نہیں رہی تھی، بلکہ خود یاجوج و ماجوج کی غارت گریوں کا نشانہ بن گئی تھی۔ البتہ جب پانچویں صدی عیسوی میں یورپ کے قبائل کی حالت بھی منقلب ہونا شروع ہو گئی اور مدنیت اختیار کر کے تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگے تو قوموں کے حافظے سے ان کا نام بھی اُتر گیا، اور یاجوج ماجوج کا اطلاق صرف اسی خطہ میں سمٹ آیا، جہاں سے پھیلنا شروع ہوا تھا۔ یعنی صرف منگولیا کے صحرا نورد قبائل ہی یاجوج و ماجوج سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ قرآن نے سورۃ انبیاء میں ان کے جس خروج کی خبر دی ہے۔ وہ منگولیا کے تاتاریوں = کا آخری خروج تھا

یورپ کی تمام موجودہ قومیں (لاطینی نسل مستثنیٰ کر دینے کے بعد) براہ راست ان ہی قبائل کی نسل سے ہیں جیسا کہ معلوم و مسلم ہے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نسل انسانی نے اکثر حالتوں میں پہلے صحرا نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے۔ پھر توطن اور اقامت گزینی اختیار کی ہے اور اس اختلاف حالت نے ہمیشہ دو طرح کے انسانی گروہوں سے دنیا کو آباد رکھا ہے۔ صحرا نورد قبائل کے گروہ اور اقامت گزینی قبائل کے گروہ۔ معیشت کی یہ دونوں حالتیں اس درجہ متضاد تھیں کہ ایک ہی نسل کے دو قبیلوں میں سے ایک قبیلہ اگر صحرا نورد رہتا تھا۔ اور دوسرا اقامت گزین ہو جاتا تھا، تو چند صدیوں کے بعد نہ صرف ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاتے تھے بلکہ بالکل متضاد قسم کی مخلوق بن جاتے تھے صحرا نورد قبائل کو غذا کے لئے جانوروں کے

قائد تھا، ایک عظیم فاتح کی حیثیت اختیار کر لی اور رومن امپائر کی دونوں مشرقی و مغربی مملکتوں کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ پھر یہی قبائل ہیں جو بالآخر اس طرح تمام یورپ پر چھا گئے کہ نہ صرف رومن امپائر کو بلکہ رومی تمدن کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دیا۔

چند صدیوں کے بعد تاریخ یہ منظر پھر دہراتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود منگولیا میں ایک نیا منگولی قائد چنگیز خان پیدا ہو گیا ہے۔ وہ تمام تاتاری قبائل کو اپنے ماتحت ایک قوم بنا دیتا ہے، اور پھر فتح و تسخیر کا ایک ایسا ہولناک سیلاب اُمنڈتا ہے جسے اسلامی ممالک کی کوئی متمدن قوت بھی نہ روک سکی۔ وسطِ ایشیا سے لے کر عراق تک جو ملک اس کے سامنے آیا، خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج سے مقصود یہی منگولین قوم اور اس کی تمام صحرا نورد اور وحشی شاخیں ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں ان کے خروج و ظہور کے مختلف دور تاریخی ترتیب سے منضبط کر لیں اسی ضمن میں یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ سائرس کے زمانے میں یہ قوم کہاں تھی، اور کیوں اسے سد تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی؟

اس بارے میں تاریخ کی شہادتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے

(۱) پہلا دور تاریخی عہد سے پہلے کا ہے جب شمال مشرق سے ان قبائل کے ابتدائی گروہ نکلے اور وسط ایشیا میں آباد ہو گئے۔ پھر جنوب اور مغرب میں پھیلنے لگے۔ اس خروج و انشعاب کی رفتار بہت سست رہی ہوگی اور بے شمار منزلیں پیش آئی ہوں گی۔

جب کبھی صدیوں کے بعد ان میں کوئی حکمران قائد پیدا ہو جاتا، اور وہ بہت سے قبیلوں کو متحد کر کے ایک فوج کی نوعیت دے دیتا تو پھر قتل و غارت گری کی ایک ایسی منظم طاقت پیدا ہو جاتی۔ جو صرف وقتی حملوں ہی پر قانع نہیں رہتی بلکہ مملکتوں اور قوموں پر قابض ہو جاتی اور شہری آبادیوں کی بڑی سے بڑی قوتیں بھی اس کی راہ نہیں روک سکتیں!

تاریخ شاہد ہے کہ صحرا نورد اور غیر متمدن اقوام کے مقابلہ میں شہری اور متمدن اقوام کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا۔ یہاں تک کہ علم و صناعت نے ایسے ہتھیار اور جنگی وسائل پیدا کر دیئے جن کے مقابلہ سے غیر متمدن اقوام عاجز ہو گئیں

چنانچہ ان شمالی مشرقی قبائل کی پوری تاریخ اسی حقیقت کا افسانہ ہے ان کی جن شاخوں نے اقامت گزینی کی زندگی اختیار کر لی تھی، وہ بلکل ایک دوسری قوم بن گئیں، اور جنہیں ایسے حالات میسر نہیں آئے، وہ بدستور صحرا نورد ہیں۔ اقامت گزین قبائل کے لئے صحرا نورد قبائل صرف اجنبی ہی نہیں ہو گئے تھے، بلکہ خوفناک بھی ہو گئے تھے، کیوں کہ ان کی روز افزوں شہریت ان کی صحرائی وحشت ناکیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ جب کبھی موقع پاتے، قرب و جوار کی آبادیاں غارت کر تے، اور اگر قبائل کا کوئی قائد نکل آتا تو ان کی غارت گریاں دور دور تک بھی پہنچ جاتیں صدیوں تک ان کی حالت ایسی ہی رہی۔ پھر جب چوتھی صدی مسیحی سے ان کے اندر ایسے قائد پیدا ہونے لگے جنہوں نے نظم و اطاعت کا راز پا لیا تھا، تو اچانک ان کی طاقت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی میں اٹیلا (Attila) نے جو ہن قبیلہ کا

علاقہ ایک وحشی اور خونخوار قوم کا مرکز بن چکا ہے، اور وہ مختلف ناموں میں اور مختلف جہتوں سے نمایاں ہوتی رہتی ہے پھر اچانک تاریخ کے افق پر "سیتھین" قوم کا نام ابھرتا ہے۔ یہ وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود کے شمالی کناروں تک آباد ہے۔ اور اطراف و جوانب میں برابر حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ یہ زمانہ آشوری تمدن کے ظہور اور بابل اور نینوا کے عروج کا تھا، اور ہیرو ڈوٹس کی زبانی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آشورین کی شمالی سرحد پر سیتھین قبائل کی غارت گریاں برابر جاری رہیں یہ شمالی سرحد بحر خزر کے جنوبی ساحل اور آرمینیا کے سلسلۂ کوہ تک پہنچی ہوئی تھی، اور وہ کاکیشیا کے درّے سے اتر کر آشوری آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ پھر ۲۰۰ قبل مسیح میں اچانک ان کا ایک عظیم گروہ اسی راہ سے اترتا ہے اور ایران کا تمام مغربی حصہ پامال کر دیتا ہے۔ یونانی مؤرخوں کا کہنا ہے کہ آشوری مملکت کی تباہی کا ایک بڑا باعث یہی غارت گری تھی [1]

(۴)، چوتھا دور ۵۰۰ قبل مسیح کا قرار دینا چاہیئے، جب سائرس کا ظہور ہوا اور فارس اور میڈیا کی متحدہ شہنشاہی کی بنیاد پڑی اس عہد میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور صدیوں تک ان کے حملوں کی کوئی صدا تاریخ کی سماعت تک نہیں پہنچتی۔ اس عہد میں صرف دو موقعوں پر اُن کا ذکر آتا ہے۔ پہلا سائرس

---

[1] ہیروڈوٹس ۱-۴-۱-

(۲) دوسرا دور صبح تاریخ کا ہے، لیکن روشنی ابھی دھندلی ہے اب اقامت گزینی اور صحرانوردی کی دو مختلف اور متوازی معیشتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ کم، ہند، ایران اور اناتولیا کے قبائل اقامت گزینی کی زندگی میں بدل چکے ہیں۔ مگر وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود تک صحرانورد قبائل کے جتھے پھیلتے جاتے ہیں اور مشرق سے نئے نئے قبیلوں کے اقدام کا سلسلہ برابر جاری ہے یہ زمانہ تقریباً ۴۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵۰۰ قبل مسیح تک کا تصور کرنا چاہیئے ؎

(۳) تیسرا دور تاریخ کی روشنی میں پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اب بحر خزر اور بحر اسود کا

؎ یہ سن تعین اس طرح کے تمام تعینات کی طرح محض تاریخی قیاسات پر مبنی ہے، اور اسی لئے اس بارے میں نظار تاریخ کی ارائیں مختلف ہوئیں۔ البتہ حال کے انکشافات سے ایک بات تقریباً پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے یعنی اڑھائی ہزار سال قبل مسیح اناتولیا میں "حتّی" "یا حتّی" تمدن شروع ہو چکا تھا۔ اور قدیم مصری تمدن کا معاصر تھا "بوغاز کوئی" میں حتّی کتب خانہ برآمد ہوا ہے اور جس میں بیس ہزار کے قریب منقوش تختیاں ملی ہیں۔ اس نے انیسویں صدی کے تاریخی تخمینے بہت کچھ بدل دیئے ہیں، اور اب یہ رجحان کہ اس زمانے کی مدت گھٹائی جائے تقریباً مفقود ہو رہا ہے

جب منگولیا میں تازہ دم قبائل کی ایک بڑی تعداد پھر تیار ہو گئی، اور چنگیز خان نے انہیں متحد کر کے ایک نئی فتح مند طاقت پیدا کر دی مندرجہ صدر خلاصہ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین قبائل کے حملوں سے غارت ہو رہا تھا، اور جس ہاتھ نے اچانک ظاہر ہو کر اُن کے حملے روک دیئے اور پھر ہمیشہ کے لیئے مغربی ایشیا یک قلم محفوظ ہو گیا، وہ سائرس کا ہاتھ۔ پس یقیناً منگولین نسل کے یہی سیتھین قبائل تھے جو یاجوج و ماجوج کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور ذوالقرنین یعنی سائرس نے اِن ہی کی راہ روکنے کے لئے سد تعمیر کی۔ جس طرح تین صدیوں کے بعد چینی مجبور ہوتے کہ انہیں روکنے کے لئے ایک دیوار تعمیر کریں۔

اب غور کرو سیتھین قبائل کے یہ حملے کس جانب سے ہوتے تھے؟ ہیروڈوٹس وغیرہ یونانی مؤرخ بتلاتے ہیں کہ صرف ایک راہ سے یعنی کاکیشیا کے درہ سے۔ یہی مقام صدیوں تک دونوں علاقوں میں درمیان کا پھاٹک رہا ہے

اب اگر سائرس ان حملوں سے محفوظ ہونا چاہتا تھا تو کیا اس کے لیئے ضروری نہ تھا کہ یہ پھاٹک بند کر دے؟ قدرتی طور پر ضروری تھا اور اِس لئے اِس نے سد تعمیر کر کے یہ راہ مسدود کر دی چونکہ ان حملوں کی صرف یہی ایک راہ تھی اور وہ اس طرح بند کر دی گئی، اس لئے یاجوجی حملوں کا بھی یک قلم خاتمہ ہو گیا

اب پھر حزقیئل نبی کی پیشین گوئی پر ایک نظر ڈالو۔ اِس میں جوج کو روش،

کے زمانے میں، جب وہ فتح بابل سے پہلے "سیتھین" قبائل کے سرحدی حملوں کا تدارک کرتا ہے۔ دوسرا دارا کے زمانے میں جب وہ باسفورس عبور کر کے دریائے ڈینوب کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے اور ان قبائل کو دور تک بھگا دیتا ہے

دارا کے حملہ کے بعد ان کا دباؤ شمالی یورپ کی طرف بڑھنے لگا

(۵) پانچواں دَور تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس عہد میں منگولین قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا ہے اور پہلے چین کی آبادیوں پر ٹوٹتا ہے پھر آہستہ آہستہ وسطِ ایشیا کی قدیم شاہراہ اختیار کرتا ہے۔ چین کی تاریخ میں انہیں ہیونگ نو (Hiung - nu) کے نام سے پکارا گیا ہے، اور یہی نام آگے چل کر "ہن" ہو گیا ہے۔

یہی زمانہ ہے جب شہنشاہ چینی شین ہوانگ ٹی نے ان حملوں کے روکنے کے لئے وہ عظیم الشان دیوار تعمیر کی جو دیوارِ چین کے نام سے مشہور ہے اور پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے اس کی تعمیر ۲۱۴ قبل مسیح میں شروع ہوئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ دس برس میں ختم ہوئی اس نے شمال اور مغرب کی طرف سے منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اس لئے اُن کا رُخ پھر وسط ایشیا کی طرف مڑ گیا

(۶) چھٹا دور تیسری صدی مسیحی کا ہے جب ان قبائل نے یورپ میں ایک نئی کروٹ لی۔ اور بالآخر رومی مملکت اور رومی تمدن کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا

(۷) ساتواں اور آخری دَور بارھویں صدی مسیحی اور چھٹی صدی ہجری کا ہے

ہوتی ہے؟ اگر حضرت مسیح سے شروع ہوتی ہوا تو ظاہر ہے کہ دسویں صدی مسیحی میں کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہزار برس سے مقصود وہ مدت ہو جو سقوط بابل سے شروع ہوتی ہے کیونکہ اس معاملہ سے پہلے بابل کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر ایک بات بن سکتی ہے۔ بابل کا سقوط چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے اور چوتھی صدی مسیحی میں یورپ کے منگولین قبائل نے رومی مملکت پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ پس یاجوج و ماجوج کا یہ خروج سقوط بابل کے ہزار برس بعد ضرور ہوا ہے

"ماجوج" کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بھی آیا ہے۔ جہاں حضرت نوح کے تین لڑکوں سام۔ حام اور یافث سے اقوام عالم کا پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یافث کی نسبت لکھا ہے کہ اس سے:

"جمر، ماجوج، مادی، یونان، توبال، مسک اور تیراس پیدا ہوئے"

(۱۰: ۲)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج سے مقصود منگولین نسل ہے کیونکہ قدیم مورخوں نے اسی تصریح کی بنا پر انہیں یافثی نسل قرار دیا ہے علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہے کہ کتاب پیدائش کا مواد قید بابل کے زمانہ میں تیار ہوا ہے، تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ماجوج اور مادیوں کو ہم نسل سمجھا جاتا تھا۔

یہ یاد رہے کہ اگرچہ دنیا عرصہ تک کتاب پیدائش کے اس بیان پر مطمئن رہی اور عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ تمام قومیں حضرت

مسک اور توبال کا سردار کہا ہے، اور یہ ٹھیک ٹھیک ان ہی قبائل کے نام ہیں۔ "روش" وہی ہے جس سے "رشیا" نکلا "مسک" وہی ہے جو "موسکوہ" ہوا۔ اور "توبال" بحر اسود کا بالائی علاقہ تھا۔

پھر کہا ہے کہ "میں تجھے پھرا دوں گا" اور "تیرے جبڑوں میں ہنسیاں ماروں گا۔"

یہ وہی واقعہ ہے کہ سائرس نے سیتھین قبائل کے منہ پھرا دیئے اور سد تعمیر کر کے اُن پر اُن کی راہ روک دی۔ پھر کہا ہے "ایسا معاملہ واقع ہوگا کہ اُن کے تمام ہتھیار جلا دیئے جائیں گے" اور "ریگزاروں کی ایک وادی میں جو سمندر کے پورب میں ہے۔ ان قوموں کا گورستان بنے گا نیز عرصہ تک لوگ لاشیں گاڑتے رہیں گے تاکہ راہ صاف کریں" یہ وہ واقعہ ہے جو دارا کے حملۂ یورپ میں پیش آیا۔ دارا کی فوج مملکت کی تمام اقوام سے مرکب تھی۔ اس میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ باسفورس عبور کر کے مشرقی یورپ پہنچ گیا تھا، اور اگرچہ یونانیوں کی بے وفائی کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا، لیکن اِس لشکر کشی میں بے شمار سیتھین مارے گئے اور اُن کی قوت عرصہ تک کے لئے مضمحل ہو گئی۔

باقی رہی وہ پیشین گوئی جو مکاشفات یوحنا میں ملتی ہے، تو مکاشفات کے اکثر مقامات کی طرح اِس مقام کی بھی کوئی جمتی ہوئی تفسیر شارحین انجیل نہ کر سکے۔ اِس میں ایک ہزار برس کی مدت بتلائی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس مدت سے مقصود کون سی مدت ہے اور کب سے شروع

تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اس طرح اس دیوار نے ایک طرف تو بحر خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا تھا، دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلوان ہونے کی وجہ سے قابلِ عبور ہو سکتا تھا

ساحل کی طرف یہ دیوار دُھری ہے۔ یعنی اگر آذربائیجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں، تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے۔ اس میں پہلے ایک دروازہ تھا دروازہ سے جب گزرتے تھے تو شہر دربند ملتا تھا۔ اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔ دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے۔ لیکن یہ دوہری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے

دونوں دیواریں جہاں جا کر ملی ہیں، وہاں ایک قلعہ ہے۔ قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا۔ لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے، اور اسی پانچ سو گز کے عرض میں دربند آباد ہے۔ اس دہری دیوار کو ایرانی قدیم سے "دوبارہ" کہتے آئے ہیں۔ یعنی دہرا سلسلہ۔

یہ قطعی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے، ساسانی عہد میں یہ مقام موجود تھا، اور اسے "دربند" کہا جاتا تھا۔ یعنی بند "دروازہ"، کیونکہ مقدسی، ہمدانی، مسعودی، اصطخری، یاقوت اور قزوینی وغیرہ تمام مسلمان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے اسی نام سے اس کا ذکر کیا ہے

نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں ہی سے پیدا ہوئی ہے
لیکن اب اس کی علمی قدر و قیمت یک قلم مشتبہ ہو گئی ہے، اور اسے کوئی بھی اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے ایک تاریخی بیان کو دیکھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک ایسا نوشتہ ہے جس میں ہمیں ۵۰۰ سال قبل مسیح کے یہودی تصورات نظر آجاتے ہیں۔ بلاشبہ ان میں ایک عنصر ان مقدس روایتوں کا بھی ہے۔ جو قومی حافظہ نے محفوظ رکھی تھیں لیکن ساتھ ہی بابلی اور آشوری روایتوں کا بھی ایک عنصر شامل ہو گیا ہے۔ جو قیامِ بابل کی طویل مدت کا قدرتی نتیجہ تھا۔

سدِ یاجوج

اب ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ سائرس نے جو سد تعمیر کی تھی اس کا صحیح محل کیا تھا، اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اسے کہاں ڈھونڈنا چاہیے؟

بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلہ کوہ ختم ہوتا ہے اور بحر خزر سے مل جاتا ہے۔ اس مقام پر قدیم زمانے سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے، جو سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے، اور اس مقام

النسل کا کیشین قبیلوں کی آمد و رفت کی راہ یہی تھی۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں، تو ایک اور مقام ملتا ہے جو درہ داریال (Darial Pass) کے نام سے مشہور ہے، اور موجودہ زمانے کے نقشے میں اس کا محل ولاڈی کیو کس (Vladi kaukas) اور ٹفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں میں ہو کر گزرا ہے اور دور تک دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے، اور ارمنی روایتوں میں اسے " آہنی دروازہ " کے نام سے پکارا گیا ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوار کس نے تعمیر کی تھی؟ تمام عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ نوشیرواں نے تعمیر کی تھی۔ چنانچہ مسعودی نے اس کی تعمیر کی بعض تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور بعد کے تمام مصنف اسے نقل کرتے آئے ہیں لیکن جب ہم قبل از اسلام عہد کے تاریخی نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے یہاں ایک دیوار موجود تھی اور اس نے شمال سے جنوب کا راستہ روک رکھا تھا چنانچہ سب سے پہلے پہلی صدی مسیحی میں مشہور عبرانی مؤرخ جوزیفس

لہ یونانی کاکیشیا، روسی کیو کز اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے

اور سب لکھتے ہیں کہ ساسانی عہد میں یہ مقام شمالی سرحد کا سب سے زیادہ اہم مقام تھا۔ کیوں کہ اسی راہ سے شمال سے حملہ آور ایران کی طرف بڑھ سکتے تھے یہ ایرانی مملکت کی کنجی تھی۔ جس کے ہاتھ یہ کنجی آجاتی، وہ پوری مملکت کا مالک ہو جاتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی حفاظت کا اس درجہ اہتمام کیا جائے

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں جب یہ علاقہ فتح کیا تو ساسانیوں کی طرح انھوں نے بھی اس مقام کی اہمیت محسوس کی۔ وہ اسے "باب الابواب"[۱] اور "الباب" کے نام سے پکارنے لگے کیوں کہ مملکت کے لئے یہی مقام شمالی دروازہ تھا۔ جو اس دیوار کے طول میں بنائے گئے تھے۔ بعضوں نے اسے "باب الترک" اور "باب الخزر" کے نام سے بھی پکارا ہے، کیونکہ تاتاریوں اور تاتارکا

---

[۱] عرب جغرافیہ نویس دربند ہی کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن عام نام باب الواب پڑ گیا تھا، اس لئے عنوان کے کتے اکثروں نے باب الابواب اختیار کیا ہے چنانچہ۔ یاقوت نے معجم البلدان میں اس مقام کا حال" باب الواب" ہی کے نام سے لکھا ہے۔ پس حرف" با" میں دیکھنا چاہیئے نہ کہ" ڈال" میں

یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ سکندر کے کسی جنرل نے یہ استحکامات تعمیر کیے ہوں گے۔ کم از کم دربند اریال کے استحکامات۔ بعد کو ساسانی فرمانرواؤں نے انہیں اور زیادہ وسیع اور مکمل کر دیا۔ چونکہ ابتدائی تعمیر سکندر کے عہد کی تھی اس لئے سکندر کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دیئے ہیں، اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کی لڑائی یا کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کر لی جائیں؟

اس طرح کے غیر معمولی استحکامات جبھی تعمیر کیے جا سکتے ہیں جبکہ امن و حفاظت کی ضرورت نے انہیں ناگزیر کر دیا ہو لیکن سکندر کو اپنی تمام فتوحات میں اس طرح کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ اس کے زمانے میں یہ علاقہ ایران کی قدیم شہنشاہی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) Khyam)
صفحہ نمبر ۲۶ ہم ان کی ایک دوسری تصنیف کا زردشت کے حالات میں حوالہ دے چکے ہیں۔

۲ے بہت ممکن ہے کہ سکندر کی نسبت یہ خیال اس بنا پر پیدا ہو گیا ہو کہ بعد کے بعض مؤرخوں نے غلطی سے اس سلسلۂ کوہ کو کاکیس لکھ دیا ہے جو بحر خزر کے مشرقی جانب واقع ہے اور جسے سکندر (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا ذکر کرتا ہے۔ پھر پروکوپیئس (Procopius) چھٹی صدی مسیحی کے اوائل میں خود اپنا عینی مشاہدہ نقل کرتا ہے کیوں کہ ۵۴۲ مسیحی میں جب رومن جنرل بلی ساریوس (Belisarius) نے اس علاقہ پر حملہ کیا ہے۔ تو یہ اس کے ہمراہ تھا۔ نوشیرواں کا زمانہ ۵۳۱ مسیحی سے ۵۷۹ مسیحی تک تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ استحکامات اس کے بنائے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

سکندر کا انتساب

اب یہاں ایک اور الجھاؤ پڑتا ہے جوزلفیس اور پروکوپیئس دونوں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ان استحکامات کا بانی سکندر تھا۔ حالانکہ سکندر کی فتوحات کا کوئی واقعہ تاریخ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اور کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس علاقہ میں آیا ہو یا یہاں کوئی جنگ کی ہو

زمانہ حال کے ایک امریکن مؤرخ مسٹر اے۔ دی۔ ولیمس جیکسن (پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی) نے اس علاقہ کی سیاحت کی ہے اور اس کے تفصیلی حالات اپنے سفر نامہ[۱] میں بیان کئے ہیں۔ وہ اس شکل کا

---

[۱] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب فرام کونسٹنٹی نوپل ٹو دی ہوم آف عمر خیام
(From Consienti nopal to The Home of Omar

حملوں کی روک تھام کی۔ سکندر کی نسبت کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ ان دو باتوں کے جمع کرنے سے جو تاریخی قرینہ پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ سد سائرس نے تعمیر کی ہوگی نہ کہ سکندر کے حکم سے اس کے کسی افسر نے۔

ثانیاً، پروکوپئس کے علاوہ دوسرے قدیم مؤرخوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ٹیسی ٹس (Tacitus) اور لیڈس (Lydus) نے۔ وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ رومی اسے "کاسپین پورٹا" کے نام سے پکارتے تھے یعنی" باب کاسپین"، لیکن اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے کہ یہ سکندر کے عہد کی تعمیر ہے

ثالثاً، ایک مثبت شہادت بھی موجود ہے جو سائرس کی طرف ذہن منتقل کر دیتی ہے۔ یہ ارمنی نوشتوں کی شہادت ہے۔ جسے قرب محل کی وجہ سے مقامی شہادت تصور کرنا چاہیئے

ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "بہاگ کورائی" اور "کایان کورائی" چلا آتا[۱] ہے دونوں کا مطلب یہ ہے کہ "کور کا درہ" یا "سوال یہ ہے کہ" کور" سے مقصود

---

[۱] دربند نامہ۔ ص۲۱۔ دربند کی تاریخ میں یہ ایک نہایت جامع کتاب ہے جو ۱۸۴۵ء میں ایک ترک (باقی اگلے صفحہ پر)

ماتحت تھا اس نے شام کی راہ سے ایران پر حملہ کیا، اور پھر وسط ایشیا ہوتا ہوا ہندوستان چلا گیا ہندوستان سے واپسی پر ابھی بابل ہی میں تھا کہ انتقال کر گیا

ایسی حالت میں وہ کون سے حالات ہو سکتے ہیں، جو کابشیا کے استحکامات پر اسے مجبور کر سکتے تھے؟ اور اگر پیش آ ئے تو کب؟

اصل یہ ہے کہ یہ استحکامات سکندر سے دو سو برس پہلے سائرس نے تعمیر کئے تھے۔ اور درّہ داریال کی سد، وہی سد ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے

حسب ذیل وجوہ و قرائن سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے

اولاً، سائرس اور سکندر کی دو باتیں تاریخ کی قطعی روشنی میں آ چکی ہیں سائرس کے زمانے میں یہاں سے سیتھین قوم کے حملے ہو رہے تھے۔ سکندر کے زمانے میں کوئی حملہ آور نہیں تھا سائرس کے لئے ضروری تھا کہ یہ راہ روکے سکندر کو کوئی ایسی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سائرس کی نسبت ہیروڈوٹس اور زینوفن کی شہادت موجود ہے کہ فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی

(بقیہ حاشیہ سابق)

نے وسط ایشیا سے ہندوستان جاتے ہوئے طے کیا تھا۔ اسٹرابو نے اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے

اور لکھے ہوتے تھا جب کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا

البتہ درۂ داریال کا مقام ٹھیک ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے۔ یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے، اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اس کے درمیان کی راہ بالکل مسدود کر دی ہے۔ چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ چارجیا میں "آہنی دروازہ" کا نام زمانہ قدیم سے مشہور چلا آتا ہے۔ اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامر کپو" [۱] مشہور ہو گیا

بہرحال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی سد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد خود اس نے یا اس کے جانشینوں نے یہ دیکھ کر کہ کاکیشیا کا مشرقی ڈھلوان بھی خطرے سے خالی نہیں، دربند کی دیوار تعمیر کر دی اور نوشیرواں نے اسے اور مضبوط کیا ہو یا ممکن ہے کہ فی الحقیقت نوشیرواں ہی کی تعمیر ہو

---

[۱] ترجمہ دربند نامہ از کاظم بیک صفحہ ۲۱۔ پروفیسر جیکسن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور اسے قدیم ایام کے نام سے تعبیر کیا ہے (فرام کونسٹنٹی نوپل ٹو ہوم آف عمر خیام صفحہ نمبر ۶۱)

کیا ہے؟ کیا یہ "گورش" کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے۔ جو سائرس کا اصلی نام تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبۂ استخریں پڑھا جا چکا ہے پروفیسر جیکسن اِس ارمنی نام کا ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ کورز کا تلفظ "سور" کرتے ہیں، اور پھر ع۔ بی کے ایک نام "سول" کا اسے ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اِس طرح لفظ کی حقیقت گم ہو جاتی ہے۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے۔ ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی، وہ درہ داریال کی سد ہے، یا دربند کی دیوار؟ یا دونوں؟

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا۔ اِس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اُس نے درمیان حصّہ پاٹ کے برابر کر دیا۔ اِس نے پگھلا ہوا تانبہ استعمال کیا تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں۔ یہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کی دیوار ہے اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے اس میں آہنی تختیوں

مصنف کاظم بیک نے لکھی ہے۔ یہ سینٹ پیٹرزبرگ یونیورسٹی میں ترکی اور فارسی کا پروفیسر تھا، اور خود دربند کا باشندہ تھا۔ ۱۸۵۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہسٹری آف دربند کے نام سے شائع ہوا۔

اپنے معاندانہ استہزاد کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی جو پیغمبرِ اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے صحیح سمجھ لی اور نقل کر دی

اس لئے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کر دیا جائے کہ شک و تردد کا کوئی پہلو باقی نہ رہے

دیوار دربند کی موجودہ حالت

دربند کی دُہری دیوار ۱۷۹۶ء تک موجود تھا جس کی تصویر ایک روسی سیاح کی بنائی ہوئی ایچ والڈ (Eichwald) نے اپنی کتاب "کوا کیسیس" میں نقل کیا ہے۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر جیکسن نے اس کا معائنہ کیا، تو گو آثار باقی تھے۔ لیکن دیوار گر چکی تھی البتہ اگہری دیوار اکثر حصوں میں اب تک باقی ہے

موجودہ زمانے کے شارحین تورات میں بھی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے کہ یاجوج و ماجوج سے سیتھین قوم مراد تھی لیکن وہ حزقیئل کی پیشین گوئی کا محمل ان کا وہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہیروڈوٹس کے قول کے مطابق ۶۳۰ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن اس صورت میں یہ مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ حزقیئل کی کتاب بابل کی اسیری کے زمانہ میں لکھی گئی ہے کیوں کہ وہ خود بھی بخت نصر کے اسیروں میں سے تھے، اور سیتھین حملہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اس باب میں مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹیانا اور جیوئش انسائیکلو پیڈیا میں لفظ God کا مقالہ دیکھنا چاہیئے۔

ہم نے ذوالقرنین کے مبحث میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے کیوں کہ زمانہ حال کے معترضین قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ

اس مقام کی علمی پیمائش و تحقیق کر کے مفصل معلومات بہم پہنچائی اور اپنے سفر نامہ جارجیا و ایران میں مجسمہ کی وہ نقل بھی شائع کر دی جو اُس نے پنسل سے تیار کی تھی۔ اِس وقت تک قدیم پہلوی زبان اور زمینی خطوط کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مجسمہ سائرس ہی کا ہے بعد کی تحقیقات نے مزید تصدیق کر دی۔ پھر ۱۸۸۴ء میں ڈیولافو (Dieulafoy) نے اپنی مشہور کتاب (Lard antique enperse) میں اِس کا اصل عکس شائع کر دیا اور اِس طرح مجسمہ کی اصل نوعیت دنیا کے سامنے آ گئی۔

اُس وقت سے لے کر یہ مجسمہ تاریخ قدیم کے مباحث کا ایک عام موضوع رہا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج تک کسی یورپین مستشرق کا ذہن اِس طرف منتقل نہیں ہوا کہ اِس کی نوعیت میں قرآن کے "ذوالقرنین" کی صریح اور قطعی تصدیق نمایاں ہو گئی ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغافل مذہبی تعصب کا نتیجہ ہے کیوں کہ اِن میں کافی تعداد ایسے اہل علم کی ہے جو یقیناً اِن تعصبات کی آلودگیوں سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ تاہم اِس میں شک نہیں، یہ تغافل علم و نظر کے عجائب مستثنیات میں سے ہے

(۲) اِس مجسمہ میں سائرس کے سر پر دو سینگ نکلے ہوتے ہیں اور اطراف میں عقاب کے سے پر۔ سینگوں کا مطلب واضح ہو چکا۔ لیکن عقاب کے سے پر کیوں بنائے گئے؟ اس کا جواب بھی

استدراک

(۱) ہم نے سائرس کے جس مجسمہ کا اوپر ذکر کیا ہے، اور جس سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ" ذوالقرنین اسی کا لقب تھا، وہ قدیم سنگ تراشی کی صناعیوں کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے۔ اور موجودہ عہد کے تمام اہل نظر کا فیصلہ ہے کہ یونانی سنگ تراشی کی صف میں اگر کوئی ایشیائی نمونہ رکھا جاسکتا ہے تو وہ یہی سائرس کا مرمری مجسمہ ہے یہ ایران کے قدیم دارالحکومت استخر سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں دارا نے شاہی محل تعمیر کیا تھا اب اس کا بقیہ صرف چند مرمری ستون رہ گئے ہیں ان ہی میں سے ایک مربع ستون پر یہ مجسمہ اُبھارا گیا تھا

سب سے پہلے ۱۸۲۵ء میں جیمس موریر (James Morier) نے اس کی موجودگی سے علمی دنیا کو روشناس کیا۔ پھر چند سال بعد سر رابرٹ کیر لیپورٹر (Robert Kerr Porter.) نے

ہمیں یسعیاہ نبی کے صحیفہ سے مل جاتا ہے۔ اس میں جہاں سائرس کے ظہور کی خبر دی گئی ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ:

"دیکھو! میں ایک عقاب کو پورب سے بلاتا ہوں۔ اس شخص کو جو ایک دُور کے ملک سے آکر میری ساری مرضی پوری کرے گا" (باب ۴۶: ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح دو سینگوں کا معاملہ دانیال نبی کے مکاشفہ سے تعلق رکھتا ہے اِسی طرح عقاب کی تشبیہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آچکی ہے خواہ یہ پیشین گوئیاں بعد کو بنائی گئی ہوں، خواہ فی الحقیقت پیشتر کی ہوں۔ لیکن یہ ظاہر ہوگیا کہ سائرس کے لئے دو سینگوں کا اور عقاب کا تخیل پیدا ہوچکا تھا، اور ٹھیک ٹھیک یہی تخیل ہے جو اِس مجسمہ میں متشکل ہوگیا ہے۔

ختم شد